بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیر آفاقی

اسلام زوال پذیر ہے یا مسلمان؟

طلوعِ اسلام کے خیالات اور قرآنی نظریات کے لئے ہمارے ذرائع ابلاغ (چاہے وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک) کے دروازے ہمیشہ سے بند رہے ہیں۔ اس کے باوجود اکثر و بیشتر مختلف اخبارات کے کالموں یا مقالات میں طلوع اسلام کے خیالات جھلک دکھا جاتے ہیں اور اس طرح فکرِ قرآنی کی اشاعت ہو جاتی ہے۔ ہم ایسے ہی مضامین یا مقالات کو ماہنامہ طلوع اسلام کے صفحات میں متعلقہ اخبار کے شکریہ کے ساتھ شائع کر دیتے ہیں۔ درجِ ذیل مضمون بھی ان مضامین میں سے ایک ہے جس میں طلوع اسلام کے افکار نمایاں طور پر جلوہ افگن ہیں۔ (مدیر)

ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام اور مسلمان قوم کو ایک ہی تصور کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اسلام دنیا میں ناکام رہا ہے۔ ہمارے بہت سارے دانشور اور دیگر مکاتب فکر کے لوگ بھی اپنی ذہنی مفلسی کی بنیاد پر اسلام کے حوالے سے دفاعی پوزیشن اختیار کرتے ہوئے اپنی کم مائیگی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ اسلام جدید زمانے کے تقاضوں کے ساتھ نہیں چل سکتا' اگر ہم اسلام اور مسلمان قوم کے فرق کو سمجھ لیں تو پھر اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

اسلام کے حقائق کی نمو تخلیقِ کائنات کے ساتھ ہی ہوگئی تھی اور ان حقائق نے رفتہ رفتہ آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ راستے میں مختلف زمانوں میں مختلف اقوام نے انہیں اپنایا تو انہیں سرفرازیاں اور خوشگواریاں نصیب ہوگئیں۔ جب انہوں نے ان حقائق کا ساتھ چھوڑ دیا تو (باقی اقوام کی طرح) مصیبتوں کا شکار ہوگئیں۔ آج سے چودہ سو سال پہلے سرزمین عرب کی ایک قوم نے ان حقائق کو اپنایا تو اسے محیر العقول ترقی نصیب ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا تو اس پر زوال آ گیا' لیکن اسلام بدستور آگے چلتا رہا۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ اسلام کس طرح خراماں خراماں آگے بڑھتا اور زمانہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے' ہمیں مسلمانوں کی تاریخ نہیں' بلکہ نوع انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہئے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ ہر وہ نظام' جسے ذہن انسانی نے وضع کیا' چند دنوں تک زندہ رہ کر ناکام

ثابت ہو گیا' لیکن اسلام آگے ہی آگے بڑھتا رہا اور بڑھتا جا رہا ہے۔ اسلام کے آگے بڑھنے کے حوالے سے چند واقعات کا ذکر ضروری ہے:

جب فرانس کے گلی کوچوں میں ملوکیت کو مٹا کر جمہوری نظام کی طرح ڈالنے کے لئے انقلاب برپا کیا گیا اور جب غلامی کے انسداد کے لئے لڑائیاں لڑی گئیں تو وہ بھی اسلام ہی کی زریں داستان کا ایک باب تھا۔ جب ہندوستان میں اچھوتوں کو ''ہریجن'' (روح خداوندی) کا حامل قرار دیئے جانے کی تحریک اٹھی تو وہ بھی اسلام ہی کی ایک ابدی حقیقت کی نمود تھی اور جب امریکہ میں سیاہ اور سفید فام میں تمیزِ رنگ ونسل مٹانے کی جدوجہد ہوئی تو یہ بھی اسلام ہی کی طرف ایک قدم تھا۔ اقوام عالم نے مل کر فیصلہ کیا کہ مختلف قوموں کے تنازعات کا فیصلہ باہمی مشاورت سے کیا جائے تو وہ بھی اسلام کی پیش کردہ تجویز پر عمل درآمد کی صورت تھی اور اگر انسانی ذہن میں یہ خیال بار بار آ رہا ہے کہ دنیا سے اسلحہ کا وجود ختم کر دیا جائے تو یہ بھی اسلام ہی کے پروگرام کی ایک کڑی ہے (جس نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا کہ جنگ کی اس وقت تک ہی ضرورت ہے' جب تک جنگ خود اپنے ہتھیار نہ رکھ دے) غرضیکہ اس ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں جہاں جہاں انسانوں کے خودساختہ نظام ہائے حیات ناکام ثابت ہوئے ہیں' وہ اسلام کے ابدی قوانین کی صداقت کا ثبوت تھا۔ ویلفیئر ریاست کا تصور' اپنی ضرورت سے زائد دوسروں کی حاجت روائی میں دینے کا فلسفہ' انسان کے ارتقائی سفر میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کا نظریہ' تحمل' رواداری اور مساوات جیسے سنہری اصول جن قوموں نے اپنائے ہیں' یہ اسلامی تعلیمات ہی ہیں۔ انسان ہونے کے ناطے سب انسان برابر ہیں' تم میں سے کوئی بڑا گناہ کرے' اس لئے نہیں بچ جائے گا کہ وہ بڑا ہے' حاکم ہے' سرمایہ دار ہے اور چھوٹے کو اس لئے سزا نہیں دی جائے گی کہ وہ غریب' بے وسیلہ' بے سہارا ہے' جن ملکوں میں ان تعلیمات پر عمل ہو رہا ہے' وہ اسلام ہی کے بنیادی اصول ہیں۔

تاریخ انسانی کا اس انداز سے مطالعہ کرنے سے جو حقیقت نظر آتی ہے' وہ یہ ہے کہ اسلام کسی مقام پر رک نہیں گیا' بلکہ یہ بھی کہ اسلام کے سوا کوئی نظام زندگی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی مقام پر جا کر ناکام ثابت نہ ہوا ہو اور اس کی جگہ اسلام کے اس اصول نے نہ لے لی ہو کہ یہ نظامِ خداوندی' تمام انسانی نظام ہائے زندگی پر غالب آئے گا۔ جس ہستی نے یہ نظام دنیا کے لئے پسند کیا ہے' اس نے بتایا کہ انسان کا مستقبل روشن ہے۔ جب تخلیق آدم کے سلسلہ میں ملائکہ نے خدا سے کہا کہ یہ دنیا میں فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں کرے گا۔ تو اس کے جواب میں خدا نے کہا کہ جو میں جانتا ہوں' وہ تم نہیں جانتے..... اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی آخری منزل' جس میں یہ صحیح مقام آدمیت پر پہنچے گا' وہ ہو گی' جس میں فساد انگیزیوں اور خون ریزیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انسان کو اس منزل کی طرف اسلام لے جا رہا ہے اور یہ اسے وہاں تک پہنچا کر رہے گا' اس لئے کہ یہ خدائے ''رب العالمین'' کا تجویز کردہ نظام ہے۔ ''رب المسلمین''

کا نہیں۔ اور رب کہتے ہی اسے ہیں جو کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج نقطۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ اگر خدا کا تجویز کردہ نظام آخری منزل تک نہ پہنچے' راستے میں ہی رک جائے تو وہ خدائے رب العالمین کا نہیں ہوسکتا۔ دنیا اس وقت خدا کے اس پروگرام (اسلام) کے اجزاء کو ایک ایک کر کے اپنا رہی ہے۔ انسان نے آخر الامر اس مقام تک پہنچنا ہے' خواہ یہ تجرباتی طریق سے پہنچے یا ایمان کی رو سے۔ ایمان کی رو سے یہ صدیوں کی مسافت لمحوں میں طے کرے گا اور تمام نقصانات سے بچ جائے گا جو تجرباتی طریق کا لازمی نتیجہ ہیں۔

اس وقت یہ سوال بڑا اہم ہے کہ دنیا کی باقی قومیں اس قدر آگے بڑھ رہی ہیں' ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہیں' خوشگواریاں اور سرفرازیاں حاصل کر رہی ہیں اور مسلمان ان سب سے پیچھے ہیں' مغلوب ہیں' رذیل ہیں۔ (اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی)..... اس وقت یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ دیگر اقوام ''انفس و آفاق کی نشانیوں'' پر غور و فکر کے بعد قرآنی حقائق کو اپنائے جا رہی ہیں۔ کائنات کے سربستہ رازوں کو بے نقاب کر رہی ہیں اور مسلمان اسی ''روایتی'' اسلام کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں' جس کی رو سے سوچنا اور سمجھنا حرام ہے۔ ان کا فہمِ اسلام عورتوں کی تصویروں پر سیاہی پھینکنا' سینماؤں کو بند کرنا' موسیقی کو ناجائز قرار دینا اور ایسے ہی دوسرے مسائل ہیں' لہٰذا یہ اقوام عالم میں سب سے پیچھے ہیں۔ (گوئٹے کی مثال کے مطابق) اسلام ایک صاف اور شفاف ندی ہے جو رواں دواں اپنی منزل کی طرف بہے جا رہی ہے۔ جو قوم اس ندی کے پانی سے اپنی زمین سیراب کرے گی' اس کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی۔ تاریخ کے ایک دور میں عرب قوم نے ایسا ہی کیا تو اسے ''ایک ایک دانے کے عوض سو سو دانے ملے''۔ جب اس نے اس ندی سے پانی لینا بند کر دیا تو اس کی کھیتیاں سوکھ گئیں' لیکن ندی بدستور بہے جا رہی ہے' جس کا جی چاہے اس سے اپنے کھیتوں کو سیراب کر لے۔ رب العالمین کا کرم ہر ایک کے لئے ہے' اس کی عنایت کبھی نہیں رکتی۔ مسلمانوں کی کھیتیاں اس لئے سوکھ گئیں' یہ زوال پذیر اس لئے ہوئے کہ انہوں نے آسمانی ندی (ہدایت) سے آبیاری چھوڑ دی' لیکن ندی بدستور بہے جا رہی ہے۔

اب ہم آتے ہیں مسلمانوں کے زوال کی طرف' مسلمانوں کی عددی تعداد اس وقت دنیا بھر میں تقریباً سوا ارب کے قریب ہے اور دنیا کا دوسرا بڑا مذہب اسلام ہے اور اگر تھوڑی سی چھان پھٹک کی جائے تو اسلامی دنیا کے اکثر ممالک دنیاوی دولت سے مالا مال ہیں' پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام کے ماننے والے زیرِعتاب ہیں' زوال پذیر ہیں۔ جب کہ قرآن کا یہ فیصلہ ہے کہ تم ہی غالب رہو گے' اگر تم مومن ہو۔ تو کیا سوا ارب انسان مومن نہیں ہیں؟ اس سوال پر غور و فکر کی ضرورت ہے' کیونکہ دنیا کے اکثر حصوں میں مسلمان آبادیاں ہیں' افریقہ میں ان کی کافی تعداد ہے۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ان کی مسلسل آبادیاں چلی جاتی ہیں۔ یورپ کے تقریباً تمام ممالک میں مسلمان بستے ہیں۔ روسی ریاستوں میں کئی ریاستیں مسلمانوں کے کنٹرول

میں ہیں' چین میں مسلمان بستے ہیں۔ مسلمان ممالک میں بیشتر حکومتیں ایسی ہیں جو بالکل آزاد ہیں۔ بعض نیم آزاد اور نیم محکوم ہیں اور بعض محکوم بھی ہیں' ان میں ایسے علاقے بھی ہیں' جہاں خالص مسلمانوں کی آبادی ہے۔ بعض ایسے بھی ہیں' جہاں مسلم اور غیر مسلم ملے جلے رہتے ہیں۔ یہ مجموعی طور پر مسلمانوں کی آبادی کی کیفیت ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ ان کی حالت کیا ہے؟ جو آزاد مملکتیں ہیں' وہ غیر مسلموں کی آزاد مملکتوں کے مقابلہ میں بہت کمزور اور ذلیل ہیں۔ افغانستان' ایران' حجاز' مصر' شام' اردن' انڈونیشیا وغیرہ حکومتیں یورپ اور امریکہ کی غیر مسلم حکومتوں کے مقابلہ میں نہ صرف کمزور ہیں' بلکہ ان کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ وہ انہیں جس حالت میں رکھنا چاہیں' انہیں رہنا پڑتا ہے۔ ان میں سے ہر حکومت کسی نہ کسی غیر مسلم حکومت سے امداد لیتی ہے۔ کھانے کے لئے غلہ ان کے ہاں سے ملتا ہے' مشینری وہاں سے آتی ہے' ٹیکنالوجی وہاں سے حاصل کرنا پڑتی ہے' ضروریات زندگی کی اہم چیزیں ان سے لینی پڑتی ہیں' لگژری کے لئے ان کے مرہون منت ہیں' دوائیاں وہاں سے آتی ہیں' ہتھیار وہاں سے ملتے ہیں' مسلمان آپس میں انہی کے دیئے ہوئے ہتھیاروں سے لڑتے ہیں' حتیٰ کہ نقد روپیہ تک ان سے ملتا ہے۔ یہ سب کچھ غیر مسلم حکومتوں سے ملتا ہے' تب جا کر ان مسلمان حکومتوں کا گذارا ہوتا ہے اور ان کا نعرہ ہے کہ ''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی''۔ ہم امریکہ کو تباہ کر دیں گے' ہم ساری دنیا میں جہاد کریں گے' اسلام کو توپوں بندوقوں اور خودکش حملوں کے ذریعے پھیلا دیں گے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

جن ملکوں میں مسلمان اور غیر مسلم ملے جلے رہتے ہیں' وہاں بھی مسلمان غیر مسلموں سے دبے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہاں اختیار اور اقتدار سب غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے وہاں کے جتنے بڑے بڑے لوگوں کا نام سننے کو ملتا ہے' وہ سب غیر مسلم ہیں۔ کسی بڑے مسلمان کا نام سننے میں نہیں آتا' فلاحی کام ہوں یا بیماری و جہالت کے خلاف ''جہاد'' مدر ٹریسا' لیڈی ڈیانا' نیلسن منڈیلا کے ناموں کا ڈنکا بجتا ہے' حالانکہ ان ملکوں میں حاکم اور رعایا کا تصور نہیں ہے' وہاں ملک کے سب باشندے حکومت کے کاروبار میں یکساں سمجھے جاتے ہیں' جبکہ یورپ اور امریکہ میں کچھ پاکستانی مسلمان حکومتی ایوانوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں' لیکن وہاں عملاً ایسا دکھائی دیتا ہے' جیسے غیر مسلم حاکم ہوں اور مسلمان محکوم۔

اب ذرا ایک نظر اپنے گھر کی طرف ڈالتے ہیں۔ آزادی سے پہلے ہندو اور مسلمان دونوں ہندوستان میں انگریزوں کے محکوم تھے' لیکن وہاں بھی مسلمانوں کی حالت ہندوؤں کے مقابلے میں کہیں کمزور تھی۔ ایسا نظر آتا تھا کہ مسلمان انگریز کا محکوم ہے اور ہندو کا بھی۔ وہاں ہماری آبادی کا نوے فیصد حصہ ہندوؤں کا مقروض ہوتا تھا' وہ تعلیم میں ہم سے آگے تھے' کاروبار میں ہم سے آگے تھے' دولت ان کے پاس بے شمار تھی' حکومت میں بھی ان کا حصہ زیادہ تھا' وہاں اب بھی کروڑوں مسلمان بستے ہیں' لیکن ان کی جو حالت زار ہے' وہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اب رہا پاکستان

تو یہاں ہمیں اللہ کے فضل سے مکمل آزادی تمام وسائل کے ساتھ ملی ہے' یہ ایک الگ بحث ہے کہ آزادی کے بعد آدھا پاکستان الگ ہوگیا اور مسلمان ایک نظریئے کے تحت اکٹھے نہ رہ سکے (باقی ماندہ پاکستان کے لئے صرف دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اس کی آزادی سلامت رہے اور مسلمان اکٹھے رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیں)۔ اگر ہم اپنی حالت پر غور کریں کہ یورپ' امریکہ' چین وغیرہ کی غیر مسلم آزاد حکومتوں کے مقابلہ میں ہماری کیا حالت ہے؟..... تو ہم ہر بات میں ان سے پیچھے ہیں اور زندگی کی بہت ساری ضروریات میں ان کے محتاج ہیں (جب کہ پاکستان وسائل کے لحاظ سے دنیا کے بہترین ممالک میں سے ایک ہے) پھر ملک کے اندر ہماری حالت یہ ہے کہ ملک کی اکثریتی آبادی کے پاس اپنے ذاتی گھر نہیں ہیں' ان میں سے بیشتر جھونپڑیوں میں رہتے ہیں' کتنی آبادی ہے جو رات کو بھوکی سوتی ہے؟ انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا' ملک کی چالیس فیصد آبادی غربت کی لکیر کے نیچے سسک رہی ہے اور ماہرین ذہنی امراض کے مطابق ملک کی چالیس فیصد آبادی ذہنی امراض کا شکار ہو چکی ہے' اس کے علاوہ دیگر بیماریوں نے بھی جکڑ رکھا ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں' جنہیں تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا تک میسر نہیں ہے۔ ہماری کتنی مائیں' بہنیں' بیٹیاں گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتی ہیں اور ان کی چادریں یہ معاشرہ تار تار کر دیتا ہے' ہمارے کتنے مریض ہیں جو بے دوا دارو مر جاتے ہیں۔ یہاں بعض سیریس مریضوں کے لئے اخبارات میں اپیلیں کرنا پڑتی ہیں' کالم نگاروں کو ان کی زندگی بچانے کے لئے دہائی دینا پڑتی ہے' لیکن بے حس مسلمان پھر بھی ان سیریس مریضوں کی مدد کے لئے آگے نہیں بڑھتے۔ کتنے لوگ ہیں' جن کے بچے ان کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں' لیکن ان کے پاس دوائی خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں کہ جنہیں کفن دفن کے لئے بھی جھولی پھیلانی پڑتی ہے۔ ہمارے ملک کے کتنے بچے ہیں جو سکولوں میں پڑھنے کے لئے خواب لئے آوارہ گردی کی دھول میں گم ہو جاتے ہیں' ان کے پاس بھاری فیس' کتابوں اور یونیفارم کے اخراجات نہیں ہوتے اور یہ اَن پڑھ جاہل رہ جاتے ہیں اور تکلیف دہ بات یہ بھی ہے کہ اِن کی آوارہ گردی کے ذمہ دار حکومت اور معاشرہ ہی انہیں مورد الزام ٹھہراتا ہے۔

کتنی جوان لڑکیاں اس لئے ماں باپ کی چوکھٹ پر بیٹھی اپنے بال سفید کرتی ہیں کہ ان کے والدین انہیں عزت سے رخصت نہیں کر سکتے۔ ہمارا عدالتی نظام ناکارہ ہے۔ انصاف ملتا نہیں' بکتا ہے۔ ہمارے تھانے' کچہریاں کرپشن کے منہ بولتے اشتہار ہیں' یہاں انسان کا شرف ذلت کی پستیوں میں دھکیل دیا جاتا ہے' یہاں ملزموں (مجرموں) کی اصلاح نہیں کی جاتی' بلکہ معصوموں کو مجرم بنا دیا جاتا ہے کہ کرائم کے فروغ میں ہی ان اداروں کی بقاء ہے۔ یہ حالت ہماری ہی نہیں..... افغانستان' ایران' عراق' شام وغیرہ جس مسلمان ملک میں چلے جائیں' وہاں یہی حالات نظر آئیں گے' بلکہ اس سے بھی بدتر' حتیٰ کہ اگر یورپ اور امریکہ کے ان ملکوں میں جائیں' جہاں مسلم اور

غیر مسلم اکٹھے رہتے ہیں' وہاں بھی مسلمان اپنی ابتر حالت اور ذہنی افلاس کی وجہ سے غیر مسلموں سے نمایاں طور پر الگ نظر آئیں گے۔

مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں' ایک دوسرے سے ان کے جغرافیائی حالات مختلف ہیں' آب و ہوا مختلف ہے' رہنے سہنے کے طریقے الگ ہیں' لیکن ان سب میں صرف ایک چیز مشترک ہے' یعنی یہ سب مسلمان ہیں' ان کا مذہب ایک ہے' لیکن فرقے' عقیدے اور سوچ جدا جدا۔ یہ ہے اس ''امت واحدہ'' کی حالت۔ تمام مسلمان خیرات پر زور دیتے ہیں' عبادات پر زور دیتے ہیں' لیکن اسلام کے بین الاقوامی پیغام کی نفی کرتے ہیں' جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اپنی ضرورت سے جو زائد ہے' وہ سب کا سب ضرورت مندوں کو دے دو۔ عبادات کے معنی پوجا پاٹ لیتے ہیں' جبکہ عبادات کو خدمت کہا گیا ہے اور خدا کی خدمت تو اس کے انسانوں کی خدمت کے ذریعے ہی کی جا سکتی ہے۔ اسلام کے پیغام میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں اور انہیں ایک جسم سے تشبیہہ دی گئی ہے کہ اگر بدن کے کسی ایک حصے میں درد ہو تو سارا بدن متاثر ہوتا ہے' لیکن ہم عملاً دیکھتے ہیں کہ مسلمان انفرادی علاج پر توجہ دے رہے ہیں۔ خیرات کی چند پڑیاں علاج تجویز کیا جاتا ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ہم کتنے مسلمان اور مومن ہیں؟

(بشکریہ روزنامہ پاکستان' 23 جولائی 2003ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ اسماعیل، کینیا

بُجھی عشق کی آگ .....

قرآن سے پہلے کائنات سے متعلق نظریہ یہ تھا کہ یہ اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اصلی اور حقیقی کائنات عالمِ مثال (World of Ideas) میں ہے اور یہ کائنات جو ہمیں اس طرح دکھائی دیتی ہے، یہ محض فریبِ تخیل ہے، دھوکا ہے، سراب ہے۔۔۔اور جب کائنات وہم وفریب ہے تو اس کے متعلق علم بھی درحقیقت علم نہیں بلکہ ظن وگمان ہے۔یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں اور کان بند کر کے عالمِ تصور میں حاصل کیا جائے۔۔۔افلاطون کے اسی فلسفے پر یونانی تصوف کی عمارت استوار ہوئی، اور اسی نے ہندوستان میں پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی۔۔قرآن آیا اور اس نے جہاں ذہنِ انسانی کے تراشیدہ دیگر غلط تصورات کا ابطال کیا وہاں اس نے تصوف اور ویدانت کے اس طلسم کی بھی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ قرآن نے نظر فریب تخیلات میں الجھی انسانیت کو للکار کر پکارا اور کہا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔اس نے کہا کہ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ مادی کائنات کو مسخر کرے اور پھر اسے قوانین خداوندی کے مطابق نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرے۔ یہ ایک عظیم پیغام تھا جس نے انسان کی دنیائے فکر وعمل میں انقلاب برپا کر دیا۔

وہ بنیادی تصورات جو تصوف کی اصل سمجھے جاتے ہیں درحقیقت دو ہیں، ایک خدا کے ساتھ براہِ راست ہم کلام ہونا جس میں عقل وخرد اور شعور وادراک سے ماوریٰ ایک صاحبِ کمال صوفی مکاشفات کے ذریعے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور اس سے باتیں کرتا ہے۔دوسرے نفسِ انسانی کا اس ذاتِ حقیقی کے ساتھ مل جانا، جسے وصال یا فنا کہتے ہیں۔تصوف کی تعلیمات کے مطابق یہ کیفیات انسان کو بڑی جانکاہی اور جگر کاوی کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔اس کیفیت کو تصوف کی اصطلاح میں ''مکمل تاریکی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔صاحبان کشف والہام دنیائے محسوسات سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدہ کی رو سے نفسِ انسانی اس ذاتِ حقیقی میں اسی صورت میں پیوست ہوسکتا ہے جب یہ خود تمام محسوس اور مادی علائق سے بلند اور پاک ہو جائے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ترکِ دنیا، ترکِ آرزو، ترکِ خیالات، ترکِ جنس، غرضیکہ روحانیت کے علاوہ ہر شے کا ترک ضروری ہے، اور حقیقی زندگی اسے سمجھا جاتا ہے جس میں انسان ہر وقت مراقبہ میں بیٹھا رموز واسرارِ کائنات کے جلوے

دیکھتا رہے۔

جس طرح کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، تصوف کے مذکورہ بالا نظریات قرآنی تعلیمات سے بالکل مختلف ہیں۔ قرآن زندگی کی ہنگامہ خیزیوں اور دنیاوی ذمہ داریوں سے علیحدہ ہونے کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ انسان کو عقل وفکر کی مدد سے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ قرآن کا یہ پیغام ہے کہ انسان کو عقل وفہم کی ساری صلاحیتیں اس لیے عطا کی گئی ہیں کہ وہ اشیاء کائنات کے ظاہری وباطنی اوصاف کو نہ صرف سمجھ سکے بلکہ ان سے پوری طرح استفادہ بھی کر سکے۔ لیکن دنیائے انسانیت کی بدقسمتی کہ جب اسلام سرزمین عرب سے باہر پھیلنا شروع ہوا تو اس کی تعلیمات میں مقامی اثرات کے سبب وہ افکار و نظریات جو یونانی فلسفہ اور ویدانتی عقائد کی دین تھے، داخل ہو گئے۔۔ وہ مسلمان جو عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا پیغام لے کر اٹھے تھے، روایات میں کھو گئے۔ ان کی راہ ومنزل تاریکیوں میں گم ہو گئی۔ قرآن کا انقلاب آفریں پیغام ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ان کے نزدیک وہی نظریات عین اسلام بن گئے جنہیں اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا۔ ان نظر فریب عقائد نے فکرِ انسانی اور ہمارے معاشرتی نظام کو کیسی کیسی اذیت ناک خرابیوں سے آلودہ کیا، اس کے متعلق صرف یہ کہنا کافی ہوگا:

کِسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ وصوفی وشاعر کی ناخوش اندیشی

(اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الزامات

اوران کی حقیقت

بدقسمتی سے پاکستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جس نے اپنی زندگی کا مشن یہ قرار دے رکھا ہے کہ طلوع اسلام کے خلاف بے بنیاد الزامات تراشے جائیں اور پھر انہیں ملک میں اس شدومد سے پھیلایا جائے کہ لوگ اس جھوٹ کو سچ سمجھ کر' طلوع اسلام کی بات سننا گوارا نہ کریں۔ چونکہ اس جھوٹے پروپیگنڈہ میں اس طبقہ کے سامنے ایک خاص مقصد ہے' اور وہ ایسا دانستہ کرتے ہیں' اس لئے ان لوگوں سے کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ البتہ جو سادہ لوح اور نیک نیت انسان ان کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہوکر دل میں غلط خیال قائم کر لیتے ہیں' ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مختصر الفاظ میں' اصل حقیقت ان کے سامنے پیش کر دی جائے۔ تا کہ وہ اس بدظنی سے بچ جائیں جسے قرآن مجید نے یہ کہہ کر گناہ قرار دیا ہے کہ

یایھا الذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم۔ (49:12)

اے ایمان والو! کسی کے خلاف بدظنی سے بہت زیادہ بچو' اس لئے کہ بعض بدظنی (انسان کو) گناہ (تک پہنچا دیتی) ہے۔

پہلا الزام:

طلوع اسلام منکرِ حدیث ہے

یہ الزام قطعاً غلط ہے۔ ہم جو کہتے ہیں صرف اس قدر ہے کہ نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ' انسانی شرف اور کردار کی انتہائی بلندی پر ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری کتبِ روایات میں ایسی باتیں بھی آ گئی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت پر طعن پڑتا ہے۔ غیر مسلم انہی روایات کی بنا پر آئے دن حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی روایات وضعی ہیں۔ ان کے متعلق ہمیں صاف الفاظ میں کہہ دینا چاہئے کہ وہ رسولؐ اللہ کے اقوال و افعال نہیں ہیں۔ یہی ہیں وہ روایات جن کے صحیح ہونے سے ہم انکار کرتے ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا (بخاری) ہم اسے صحیح حدیث نہیں مانتے' اور ہمارا خیال ہے کہ آپ بھی صحیح نہیں مانتے ہوں گے۔ اس قسم کی حدیثوں کے متعلق ہم کہتے یہ ہیں کہ یہ رسولؐ اللہ کی ہو نہیں سکتیں۔ یہ وضعی ہیں اور حضورؐ کی طرف یونہی منسوب کر دی گئی ہیں۔ یعنی ہم رسولؐ اللہ کی حدیث کا انکار نہیں کرتے بلکہ کہتے یہ ہیں کہ اس قسم کی احادیث کی حضورؐ کی طرف نسبت صحیح نہیں ہے۔

ایسی روایات کو چھوڑ کر' وہ احادیث جو نہ قرآن مجید کے خلاف ہوں اور نہ جن سے نبی اکرمؐ یا صحابہ کرامؓ کی شان کے خلاف کوئی طعن پڑتا ہو' ہم انہیں صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دوسرا الزام:

طلوع اسلام منکرِ سنت ہے

اس سنگین ترین الزام کی تردید میں ہم اس سے زیادہ کچھ اور کہنا ضروری نہیں سمجھتے کہ پرویز صاحب کی مایہ ناز کتاب' معراج انسانیت[1]' کا ایک اقتباس درج کر دیں جو طلوع اسلام کے صفحات میں کئی بار پیش کیا جا چکا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت' اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جس کو دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ
>
> مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
> بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رَو
>
> (معراج انسانیت ص 175)

جس کا یہ ایمان ہو کیا اُسے منکرِ سُنت کہا جا سکتا ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تیسرا الزام:

طلوع اسلام رسالت پر ایمان ضروری نہیں سمجھتا

اس الزام کی تردید میں بھی ہم پرویز صاحب کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ وہ ''سلیم کے نام خطوط'' (جلد اول ص 84) میں لکھتے ہیں:-

ذرا سوچو کہ جب ایک مسلمان کہتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو اس کے پاس اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ قرآن واقعی خدا کا کلام ہے (معاذ اللہ! رسولؐ اللہ کا خود ساختہ نہیں۔) تاریخ شاہد ہے (اور اس کا ہمیں بھی اقرار ہے) کہ دنیا کو قرآن محمدؐ ابن عبداللہ نے دیا تھا۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہوا؟ اس کا صرف ایک ہی ثبوت ہے کہ خود محمدؐ ابن عبداللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ کلام میرا نہیں' خدا کا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت پر ایمان نہ لائے' قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں لا سکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چوتھا الزام:

طلوع اسلام سُنت رسُولؐ اللہ کو حُجت نہیں مانتا

جیسا کہ ''الزام نمبر 6'' کے تحت آپ دیکھیں گے' طلوع اسلام کا عقیدہ اور مسلک یہ ہے کہ مختلف ارکانِ اسلام (نماز روزہ وغیرہ) کو اُمت کے مختلف فرقے' جس جس طریقے سے ادا کرتے چلے آ رہے ہیں' کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا ردو بدل کر سکے' یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے۔

اب سوچئے کہ جو شخص (مثلاً) نماز کے مروجہ طریقہ میں نہ خود ردو بدل کرتا ہے نہ کسی اور شخص کو اس کا حق دیتا ہے' وہ سنتِ رسولؐ اللہ کو حجت نہیں مانتا تو اور کیا کرتا ہے۔ حجت کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اسے مستند سمجھا جائے اور کسی شخص کو اس میں ردو بدل کرنے کا مجاز نہ سمجھا جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پانچواں الزام:

طلوع اسلام، حکومت کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے

اس الزام کی تردید میں ہم پرویز صاحب کے اس خط کا متعلقہ اقتباس درج کر دینا کافی سمجھتے ہیں جو انہوں نے (کفر کے فتویٰ کے جواب میں) مفتی محمد شفیع صاحب کے نام لکھا تھا۔

> اطاعتِ رسول اور اطاعتِ خدا کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صورت یہ نہیں تھی کہ ہر شخص اپنے اپنے مفہوم کے مطابق خدا اور رسولؐ کی اطاعت کر لیتا تھا۔ اس کی صحیح شکل تھی کہ حضورؐ کے بعد جو خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم ہوئی تھی اس سے پوچھا جاتا تھا کہ فلاں معاملہ میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے گی جو فیصلہ وہاں سے ملتا اسے خدا اور رسول کی اطاعت سمجھا جاتا۔ اسی سے وحدتِ امت قائم تھی۔ جب خلافت باقی نہ رہی تو خدا اور رسولؐ کی اطاعت انفرادی طور پر ہونے لگی۔ اس سے امت میں افتراق پیدا ہوا۔ امت میں دوبارہ وحدت پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم کی جائے اور اس کے فیصلوں کے مطابق خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی جائے۔ اسی خلافت کو بغرضِ اختصار، مرکزِ ملت یا اسلامی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور میں اس کی بار بار وضاحت کر چکا ہوں۔ میں نہ ہر نظامِ حکومت کو اسلامی نظام کہتا ہوں اور نہ اس کے فیصلوں کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت۔۔ میرے نزدیک خلافت علیٰ منہاج نبوت کے علاوہ کوئی نظام اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ اسے مرکزِ ملت قرار دیا جا سکتا ہے۔

(طلوع اسلام۔ مئی جون 62ء ص 153-152)

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم اپنے آپ کو نہ اس وقت ان طریقوں میں کسی قسم کے رد و بدل کرنے کا مجاز سمجھتے ہیں جن پر اُمت کاربند ہے نہ خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھیں گے۔ ہم اس وقت اس طریقے کے مطابق چلیں گے جس پر وہ خلافت ہمیں چلائے گی۔ البتہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر دین کی حکمت اور امت کی بہتری کی خاطر وہ خلافت کسی سابقہ فیصلہ میں کچھ تبدیلی کرنا چاہے، تو وہ ایسا کرنے کی مجاز ہو گی (مثلاً) نبی اکرمؐ کے زمانہ میں تمام مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتی تھیں، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس طریق کو بدل دیا اور مفتوحہ زمینوں کو، حکومت کی تحویل میں لے لیا، تاکہ اس سے افرادِ مملکت کی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب پھر اسی قسم کی خلافت قائم ہو جائے، جیسی حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھی، تو وہ اس قسم کے فیصلے کرنے کی مجاز ہو گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چھٹا الزام:

تین نمازیں۔ نو دن کے روزے

کہا جاتا ہے کہ طلوع اسلام کہتا ہے کہ نمازیں صرف تین وقت کی ہیں اور روزے نو دن کے۔

یہ سرتاسر جھوٹ ہے۔ طلوع اسلام نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ اس کے برعکس ہم نے بار بار اعلان کیا ہے کہ امت کے مختلف فرقے جس جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے چلے آ رہے ہیں، ہمیں ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا حق حاصل نہیں، نہ ہی کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنے کا۔۔ البتہ ہم یہ ضروری کہتے ہیں کہ

(1) ان باتوں میں مختلف فرقوں میں جو اختلاف پایا جاتا

ہے ان کی بنا پر آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔۔۔

اور

(2) نماز، روزہ وغیرہ کو محض رسمی طور پر ادا نہیں کر لینا چاہئے۔ اس روح اور مقصد کو بھی سامنے رکھنا چاہئے جن کے لئے یہ احکام دیئے گئے تھے۔ رسمی نمازیں اور بے روح روزے، وہ انقلاب نہیں پیدا کر سکتے جو انقلاب محمد رسولؐ اللہ والذین معہٗ نے دنیا میں پیدا کر کے دکھایا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ساتواں الزام:

اُردُو میں نماز

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ طلوع اسلام نے اُردو میں نماز پڑھنے کا طریقہ ایجاد کیا ہے، یہ طلوع اسلام کے خلاف کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ کچھ سال اُدھر کا ذکر ہے کہ لاہور میں کسی صاحب نے عید کی نماز اُردو میں پڑھائی۔ جب اس واقعہ کی خبر طلوع اسلام کو پہنچی (جس کا دفتر اُس زمانہ میں کراچی میں تھا) تو اُس نے، سب سے پہلے اس کی مخالفت کی اور لاہور میں بڑے بڑے پوسٹر اس کے خلاف لگوائے۔ اس کے بعد یہ آج تک اس تحریک کی مخالفت کرتا چلا آ رہا ہے۔

اس ایک واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ طلوع اِسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والے کس دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آٹھواں الزام:

طلوع اسلام ایک نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے

طلوع اسلام پہلے دن سے اعلان کرتا چلا آ رہا ہے کہ اسلام دُنیا میں امتِ واحدہ پیدا کرنے کے لئے آیا تھا اور نبی اکرمؐ نے ایسی اُمت پیدا کر کے دکھا دی تھی جس میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ قرآن کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جس بات کو طلوع اسلام، خلافِ اسلام اور شرک قرار دیتا ہے کیا وہ خود اس کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ کسی مذہبی فرقہ سے، نہ ہی وہ کوئی اپنی سیاسی پارٹی بنانا چاہتا ہے نہ مذہبی فرقہ۔ وہ امت میں اتحاد کا علمبردار ہے اور پوری نوع انسانی کا ایک عالمگیر برادری بنانے کا داعی۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نواں الزام:

طلوع اسلام قرآن کو نئے معنی پہناتا ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان کو حکم دیا ہے کہ وہ قرآن کریم میں غور و فکر کرے وہ اس میں غور و تدبر نہ کرنے والوں کو بڑی سخت سرزنش کرتا ہے۔ وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو حیوانات سے بھی بدتر قرار دیتا ہے۔

طلوع اسلام، اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق، قرآن کریم میں غور و تدبر کرتا ہے اور اس کے نتائج دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کی سند خود قرآن سے پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ بالضرور اس کے پیش کردہ مفہوم کو صحیح سمجھے، نہ ہی وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے، غلطی سے مبرا اور حرفِ آخر ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے انفرادی غور و فکر کا حق کسی سے چھینا نہیں جا سکتا۔ آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن اسے غور و فکر کرنے سے نہیں روک سکتے؟ اگر کسی کو غور و فکر کا حق دیا جانا مقصود

نہ ہوتا' تو اللہ تعالیٰ غور وفکر کرنے کا حکم کیوں دیتا؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دسواں الزام:

اسلاف کی مخالفت

اس سلسلے میں عوام کو یہ کہہ کر بھڑکایا جاتا ہے کہ دیکھو' یہ شخص (پرویز) یہ کہتا ہے کہ

(1) قرآن کو آج تک میرے سوا کسی نے نہیں سمجھا۔

(2) جو کچھ ہمارے پاس اسلاف سے آ رہا ہے' اس کو دریابُرد کر دینا چاہئے۔

(3) تمہارے ائمہ اور اسلاف سب (معاذ اللہ) جاہل تھے۔ وغیرہ وغیرہ

یہ کچھ نہ کبھی پرویز صاحب نے کہا ہے' نہ طلوع اسلام نے' وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ

''ہمارا یہ مطلب نہیں کہ سلف سے جو کچھ تمہارے پاس آیا ہے وہ (معاذ اللہ) سب کا سب گمراہ کن ہے۔ ایسا کون کہہ سکتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں ان سے ملا ہے' آنکھیں بند کر کے اس کی پیروی مت کرو بلکہ شمع قرآنی کی روشنی میں ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھو۔ وہ بھی ہماری طرح انسان تھے' غلطی کر سکتے تھے' لیکن قرآن کی کسوٹی کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔''

(طلوع اسلام۔ بابت اکتوبر 49ء)

اس کا کہنا صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ اسلاف سے چلا آ رہا ہے ہمیں چاہئے کہ اسے قرآن کریم کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لیں' جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے صحیح تسلیم کر لیں۔ جو اس کے خلاف ہو اسے چھوڑ دیں۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' ہماری کتب روایات میں اور اسلاف کی کتابوں میں بعض باتیں ایسی آ گئی ہیں جو قرآن کے خلاف جاتی ہیں۔ ان باتوں کے متعلق طلوع اسلام کا مسلک وہ ہے جسے پرویز صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

میرے نزدیک نہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی بات (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف فرما سکتے تھے اور نہ ہی میں ان بزرگوں کے متعلق ایسا گمان کر سکتا ہوں کہ انہوں نے قرآن کے خلاف کچھ پیش کیا ہو۔ لہٰذا یہ چیزیں رسولؐ اللہ اور ائمہ ملت کی طرف غلط منسوب کر دی گئی ہیں (اور یہی عجم کی سازش تھی) اگر اس پر بھی کسی کو اصرار ہے کہ نہیں! یہ باتیں رسولؐ اللہ (اور ائمہ کرامؒ) ہی کی ہیں تو میں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ یہ جرأت آپ کو مبارک ہو۔ میں تو اس کے تصور سے بھی کانپتا ہوں کہ کسی ایسی بات کو جو قرآن مجید کے خلاف ہو' (معاذ اللہ) رسولؐ اللہ یا حضورؐ کے کسی سچے متبع کی طرف منسوب کیا جائے۔

(اسباب زوال امت ص 174)

سوچئے کہ کیا یہ شخص اسلاف کا زیادہ احترام کرتا ہے' یا وہ جو اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ باتیں جو قرآن کے خلاف ہیں ہمارے اسلاف نے ضرور کہی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گیارھواں الزام:

دعوائے نبوّت

جب ان لوگوں سے کوئی اور بات بن نہیں پڑتی تو کہہ دیتے ہیں کہ تم دیکھ لینا۔ پرویز صاحب ایک دن نبوت کا دعویٰ کر دیں گے۔

پرویز صاحب کا عقیدہ یہ ہے (جس کا وہ سینکڑوں مقامات پر شرح وبسط سے اعلان کر چکے ہیں) کہ

(1) نبی وہ ہے جسے خدا کی طرف سے وحی ملے۔

(2) وحی سے مطلب ہے خدا کی طرف سے براہ راست حقیقت کا علم حاصل ہونا۔

(3) نبی اکرمؐ کے بعد خدا کی طرف سے وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

(4) ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی شخص کو خدا کی طرف سے براہ راست کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے جو کچھ دینا تھا' قرآن کریم میں دے دیا اور اسے قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا۔

(5) ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وحی کا دروازہ بند ہو گیا لیکن کشف اور الہام کا دروازہ کھلا ہے۔ کشف اور الہام کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ چیز ختم نبوت کے منافی ہے اور وہ سیڑھی ہے جس سے لوگ نبوت تک کا دعویٰ کرنے لگ جاتے ہیں اس لئے ان راستوں کا بند کرنا نہایت ضروری ہے۔

اب آپ سوچئے کہ جو شخص ختمِ نبوت کے بعد وحی تو ایک طرف' کشف والہام کا بھی قائل نہ ہو وہ نبوت کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے۔ پرویز صاحب کا ''دعویٰ'' صرف اس قدر ہے کہ وہ قرآن کے ایک ادنیٰ طالب علم ہیں اور بس۔

بارھواں الزام:

کمیونسٹ

ان پر جھوٹا پراپیگنڈہ کرنے والوں کی دیدہ دلیری کی انتہا ہو جاتی ہے۔ جب یہ لوگوں میں مشہور کرتے ہیں کہ طلوع اسلام' ملک میں کمیونزم پھیلاتا ہے۔ یہ کچھ اس طلوع اسلام کے خلاف کہا جاتا ہے جس نے' تشکیل پاکستان سے اس وقت تک کمیونزم کے خلاف مسلسل جہاد شروع کر رکھا ہے اس نے مختلف انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلام کے لئے سب سے بڑا چیلنج کمیونزم ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ اس لئے۔۔۔

نہ کوئی مسلمان کبھی کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے۔

(طلوع اسلام۔ستمبر 1962ء ص33)

اس لئے وہ دورِ حاضر میں کمیونزم کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتا ہے۔

البتہ وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ قرآن کریم جس قسم کا نظام قائم کرتا ہے اس میں کوئی شخص نہ بھوکا رہ سکتا ہے' نہ ننگا۔ اس میں ہر فردِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری' مملکت پر ہوتی ہے۔ مملکت اپنی اس اہم اور عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے' ضرورت سمجھے تو ملک کے ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے لیکن مملکت کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی جس سے کسی فرد کی انفرادیت (Individuality) سلب ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام میں افراد کو طبعی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے اطمینان ہی اس لئے دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی وحی خداوندی کے تابع رکھ کر' اپنی ذات (انسانی صلاحیتوں) کی نشوونما کر سکیں اور اس طرح دنیا میں بھی سرفرازی وسربلندی کی زندگی بسر کریں اور حیاتِ اخروی میں زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکیں۔ سوچئے کہ کمیونزم کو' جو نہ وحی خداوندی کو مانتی ہے اور نہ حیاتِ اخروی کو' اس نظام حیات سے کیا واسطہ؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ الزامات، جو طلوع اسلام کے خلاف تراشے جاتے ہیں اور جن کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی روشنی میں دیکھئے کہ کیا ان الزامات میں کوئی صداقت ہے؟ یہ لوگ طلوع اسلام کے خلاف اس قدر جھوٹا پراپیگنڈہ اس لئے کرتے ہیں کہ طلوع اسلام اس تھیا کریسی کی مخالفت کرتا ہے جسے یہ لوگ یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں اور جس میں انسانیت کا گلا گھٹ کر رہ جاتا ہے۔

یہ حضرات طلوع اسلام کے خلاف جھوٹے پراپیگنڈے تک ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر قسم کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اس باب میں آپ مولانا مودودی صاحب کے ایک ممتاز اور پرانے معتقد حکیم عبدالرحیم اشرف کا ایک بیان سن لیجئے، جو ان کے اخبار ''المنیر'' بابت 19 ستمبر 1958ء میں شائع ہوا تھا (اشرف صاحب اب مودودی صاحب سے الگ ہو چکے ہیں) انہوں نے لکھا تھا:-

> میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے 17 دسمبر 1957ء کو ملتان جیل میں ملاقات کی۔ اس موقعہ پر منجملہ دیگر امور کے ''منکرین سنت'' اور ان کے فتنے کا بھی ذکر آ گیا۔ اس پر مولانا ممدوح نے اشاعتِ لٹریچر کی ایک اسکیم بتلائی اور اس کی تکمیل کے سلسلے میں فرمایا کہ آپ چودھری غلام محمد صاحب سے کہیں (جو اس زمانہ میں جماعت اسلامی سندھ کے قیم تھے) کہ وہ دفتر طلوع اسلام سے رابطہ پیدا کریں اور وہاں کسی شخص کی تالیف قلب کر کے طلوع اسلام کے پتے حاصل کریں۔

آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جو لوگ رشوت دے کر پتے حاصل کرنے تک سے بھی گریز نہ کریں وہ الزام تراشی اور کذب بافی میں کیا باک محسوس کریں گے؟

ایک درخواست

اس سلسلہ میں ہماری آپ سے صرف ایک درخواست ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ سے کوئی شخص طلوع اسلام کے خلاف کوئی بات کہے۔ تو آپ اس سے اتنا کہئے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اس کی تائید میں طلوع اسلام یا پرویز صاحب کی کوئی تحریر دکھا دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد وہ کس طرح اپنا سا مُنہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا یہ پروپیگنڈہ کامیاب ہی اس لئے ہو رہا ہے کہ لوگ ان سے اس کا مطالبہ نہیں کرتے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اس کی تائید میں طلوع اسلام یا پرویز صاحب کی تحریر دکھا دیجئے۔

یا آپ کم از کم اتنا ہی کیجئے کہ جو کچھ آپ سے کہا جائے اس کے متعلق طلوع اسلام یا پرویز صاحب سے خود دریافت کر لیجئے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

درسِ قرآن

اس کے جواب میں بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ پرویز صاحب اپنے درسِ قرآن میں اس قسم کی قابلِ اعتراض باتیں کہتے ہیں۔ پرویز صاحب کا درس ہر اتوار کی صبح ان کے مکان (واقعہ 25 بی، گلبرگ 2، لاہور) میں ہوتا ہے۔ جس کا جی چاہے اسے آ کر سُن لے اور اپنا اطمینان کر لے کہ اس میں کون سی بات قابلِ اعتراض ہوتی ہے۔

پھر اتنا ہی نہیں کہ وہاں درس دیا گیا اور بات ہوا میں اڑ گئی۔ ان کا ہر درس ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور یہ ٹیپ (ہر اتوار کی صبح، لاہور) میں 25 بی، گلبرگ 2، میں سنایا جاتا ہے اس کے بعد دیگر مقامات میں اسے دہرایا جاتا ہے۔ آپ ان مقامات میں سے کسی جگہ اس درس کو سنئے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ آیا اس میں کوئی قابل اعتراض بات ہوتی ہے۔۔؟ محض سنی سنائی باتوں پر نہ جائیے کیونکہ خدا کا حکم ہے کہ

لا تقف ما لیس لک به علم۔ (17:36)

جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگ جایا کرو۔

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور مذہبی رواداری

(ماخوذ از طلوع اسلام جون 1939ء)

غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ ایک مکتب میں جب بچوں کو شرارت سوجھتی اور وہ مولوی صاحب کے پنجہء استبداد سے کم از کم کچھ وقت کے لئے چھوٹنا چاہتے تو وہ منظّم سازش کرتے' ایک آتے ہی کہتا او ہو! قبلہ خیریت ہے۔ آج نصیب اعدا کچھ طبیعت مضمحل سی نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھائی رات کچھ دیر سے سویا اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ رفت گذشت۔ دوسرا آتا اور السلام علیکم کے بعد مولوی صاحب کے چہرہ پر متردّدانہ نگاہ ڈال کر پوچھتا کہ مولانا خیریت ہے! آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں' چہرے پر کچھ تمازت کے آثار بھی ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھئی کچھ اعضاء شکنی سی محسوس ہو رہی ہے۔ تیسرا ابھی آ کر بیٹھنے بھی نہ پاتا کہ ایک گہری تشویش سے پوچھتا کہ مولوی صاحب' مزاج گرامی میں کچھ خرابی سی نظر آ رہی ہے اب مولوی صاحب کا دل بھی ڈوبنا شروع ہو جاتا' فرماتے کہ ہاں کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی ہے۔ چوتھا طالب علم ابھی آنے بھی نہ پاتا کہ مولوی صاحب لحاف اوڑھے حجرے میں دراز ہیں اور نبض پر ہاتھ رکھو تو سچ مچ تپ چڑھ رہی ہے۔

مولوی صاحب کے بخار آ جانے کا واقعہ افسانہ ہو یا حقیقت' لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ پروپیگنڈا اگر منظّم طریقہ سے کیا جائے تو فی الواقع قلب ماہیت پیدا کر دیتا ہے۔ اشیاء کی نوعیت اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے زاویئے بدل دیتا ہے۔ جو چاہتا ہے منوا لیتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے تسلیم کرا لیتا ہے۔ یہی وہ سحر سامری ہے جس کی نگاہ بندی سے قوموں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ **لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا۔ ولھم اذان لا یسمعون بھا۔** آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی عینک سے ہیں۔ کان اپنے ہیں' لیکن سنتے کسی اور کے آلہء صوت سے ہیں۔ دل اپنے ہیں' لیکن سمجھتے کسی اور کے دماغ سے ہیں **اولئک کالانعام بل ھم اضل۔** بالکل ''ہز ماسٹرز وائس'' ہوتے ہیں۔ (7/179)

اسلام کے ساتھ بھی دنیا میں ایسا ہی ہوا ہے۔ اس نے ابھی اپنی تربیت گاہ سے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ یورپ کے ارباب حل وعقد کو اس سے خواہ مخواہ ایک خطرہ محسوس ہوا اور انہوں نے اس کا بہترین علاج یہی سوچا کہ اسلام کو اس کے اصلی خدوخال میں کہیں ظاہر ہی نہ ہونے دیا جائے۔ ارباب سیاست کے پیش نظر کچھ اپنی مصلحتیں تھیں' خداوندان مذہب اپنی سیادت کا تحفظ چاہتے تھے۔ چنانچہ دونوں گروہ اس مشترکہ مقصد کو لے کر اٹھے اور زبان وقلم کے زور سے اسلام کی ایک ایسی بھیانک تصویر کھینچی کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی جب اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو کانپ کر رہ جائیں۔ جب دول یورپ کا تسلط دیگر ممالک پر ہوا تو انہوں نے وہاں بھی اس مقصد کو فراموش نہیں ہونے دیا اور چونکہ قاعدہ ہے کہ حاکم قوم کی ہر ادا میں اک شانِ خداوندی نظر آیا کرتی ہے۔ لہٰذا اقوام یورپ نے اسلام کی تصویر کے جو جو ایڈیشن شائع کئے۔ دل و

دماغ کے چوکھٹوں میں فریم کرا کے رکھے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیائے تہذیب وتمدّن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے قتل وغارت گری' بربادی وتباہی' ہلاکت وخوں ریزی' جور وتظلم' ستم و استبداد کے خونی مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ جن میں نظر آتا ہے کہ (معاذ اللہ) وحشی وخوں خوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں سیل حوادث کی طرح کف بردہاں بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ جن کے جلو میں سبعیت و بربریت کے مجسمے ہولناک آہن پوش جنات کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں امنڈتے چلے آتے ہیں اور اس قہر خداوندی' اس سیلاب بلا' اس طوفان بدتمیزی کے سامنے تہذیب وتمدّن' علم وعمرانیت' عدل وانصاف' عفت وعصمت' مذہب ومسلک ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں۔ مظلوموں کی فریاد' یتیموں کی آہ وبکا' بیواؤں کا نالہ وفغاں آسمان تک جاتا اور ٹکرا کر واپس آجاتا ہے' کہ گویا (نعوذ باللہ) اس خوں خوار قوم کے خدا کا دروازہ ان سب کے لئے بند ہے۔ جہاں جہاں سے یہ قیامت صغریٰ گذرتی ہے آبادیاں ویرانہ بن جاتی ہیں۔ بستیاں اجڑ جاتی ہیں۔ کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتے ہیں۔ تہذیب وتمدّن کے آئینہ دار قصر شاہی کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار نظر آتے ہیں' کسی جگہ زنّار کا ڈھیر دکھائی دیتا ہے۔ مندر ویران ہیں۔ گرجے مسمار ہیں۔ نہ برہمن کو کہیں امن ہے نہ کلیسا کے راہب کے لئے ایمن۔ نہ عورتیں محفوظ ہیں' نہ بچے مصئون۔ کچھ قتل کر دیئے گئے' جو باقی بچ گئے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے حبشی سرداروں کے کوڑے کھاتے نخاس کی طرف گھسٹتے چلے جا رہے ہیں کہ وہاں انسانیت عظمیٰ دو دوٹکوں میں فروخت کی جائے۔

غرضیکہ یہ ہے وہ تصویر جو اسلام کے نام کے ساتھ ہی سامنے آکر آنکھ کی پتلیوں میں سکتہ پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کا خون کھولنے لگتا ہے۔ حقارت وتنفر انتقام و مواخذہ کے بخارات قلب سے اٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں اور اسے اس ''عالم سوز تہذیب اور ننگ انسانیت تمدّن'' کو امن وسلامتی کی دنیا سے مٹا دینے کی مختلف تدابیر وخیالات کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں۔ آیئے آج کی مختصر سی صحبت میں دیکھیں کہ جس تصویر کا یہ ایڈیشن آپ کے سامنے ہے اس کے صحیح خطوط کیا ہیں اور جس تہذیب وتمدن کو تلوار اور آگ کی نسبت سے انسانیت سوز سمجھا جا رہا ہے اس کی اصلیت کیا ہے۔ اسلام کی صورت مسخ کرنے والوں کی یہ بے باک جرأتیں فی الحقیقت قابل داد ہیں کہ یہ سب کچھ ایک ایسے مذہب کے متعلق پیش کیا جاتا ہے جس کا اصل دستور اساسی ایک ایک حرف اور نقطہ کی صحت کے ساتھ آج دنیا کے ہر کتب فروش کی دوکان سے مل سکتا ہے۔ اور جس کے صحیح علم برداروں کا ایک ایک نقش قدم مستند تواریخ کے اوراق پر جلی اور نمایاں نظر آتا ہے۔ اس مضمون میں ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ خدا کی بادشاہت میں غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے گا۔ ہم اس وقت تعلیمی اسناد کے بجائے تاریخی اشتہاد سے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت الٰہی میں پوری طاقت اور قوت کے ہوتے ہوئے محکوم ومفتوح غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جاتا تھا اور انہیں بالخصوص مذہبی آزادی کس درجہ حاصل تھی۔ اس مضمون میں ہم تاریخی شہادات بالعموم غیر مسلم مصنّفوں اور مورخوں کے حوالوں سے پیش کریں گے تاکہ کسی قسم کے تعصب' جنبہ داری اور رجحان قلبی کا شائبہ نہ رہے یہ بھی واضح رہے کہ وہ سلطنت جسے ہم ''خدا کی بادشاہت'' کے مقدّس نام سے منسوب کرتے ہیں۔ قرن اولیٰ کے ایک مختصر سے عرصہ پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد جو حکومت قائم ہوئی اسے

آپ مسلمانوں کی سلطنت تو کہہ سکتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں خدا کی حکومت نہیں کہہ سکتے۔ بایں ہمہ اس حکومت میں بھی چونکہ مسلمانوں کے سامنے قرآنی تعلیم اور اسلامی روایات کے نقوش موجود تھے۔ اس لئے غیر مسلموں سے رواداری کے باب میں اس زمانہ میں بھی ہمیں ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو دوسرے مذہب کی سلطنتوں میں معدوم ہیں۔

اگرچہ غیر اقوام کے ساتھ ربط وضبط تو عہدِ رسالت مآب صلعم سے ہی شروع ہوگیا تھا اور فتح خیبر یہود مدینہ اور فتح مکہ جیسے مقامات پر جس قسم کی رواداری کی مثالیں ملتی ہیں تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن بہ حیثیت حکومت عہدِ فاروقی سے اس کا سلسلہ بڑھا ہے اور چونکہ اس عہد کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے ہم شروع میں اسی عہد کے چند ایک واقعات پر نظر ڈالتے ہیں۔ اسلامی عہدِ حکومت میں غیر مسلم رعایا کو ذمی کہا جاتا تھا۔ جب یوروشلم فتح ہوا ہے تو وہاں کے ذمیوں کے ساتھ ایک عہد نامہ ہوا' اس کے اقتباسات سے اندازہ فرمائیے کہ بحیثیت فاتح۔ مغلوب ومفتوح قوم کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا گیا۔

''یروشلم کی غیر مسلم رعایا کو ان کی جان و مال' اولاد اور عبادت گاہوں' صلیبوں اور ہر اس چیز کی جو ان کی ملکیت میں ہے حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے۔ ان کی زمینوں اور ان کے مذہب میں کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے گا' ان کے کلیساؤں کو نہ تو منہدم کیا جائے گا اور نہ کسی قسم کا اور نقصان پہنچایا جائے گا' ان کے اوقاف اور ان کے وقار کو بحال رکھا جائے گا۔ اہل یروشلم کو اپنے مذہب کی پابندی میں ہر قسم کی آزادی ہوگی اور ان پر کسی قسم کا ظلم وستم روا نہ رکھا جائے گا۔''[1]

فتح یروشلم کے بعد حضرت عمرؓ جب گرجے کا ملاحظہ فرما رہے تھے تو وہیں نماز کا وقت آ گیا بطریق نے کہا کہ آپ وہیں نماز ادا کر لیں لیکن آپ نے اس بنیاد پر انکار کر دیا کہ مبادا بعد میں آنے والے مسلمان سنتِ عمرؓ کی تقلید میں اس گرجا کو مسجد میں تبدیل کر لیں۔ تالیف قلوب۔ بالغ نظری اور مذہبی رواداری کا یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے سر ولیم میور جیسا متعصب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور اس نے اپنی کتاب (The Caliphate-- It's Rise and Fall.) میں اس کا ذکر کیا ہے حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جملہ اقوامِ عالم میں مذہبی تعصب جنون کی حالت تک پہنچ چکا تھا۔ اسی یروشلم میں مسلمانوں کی فتح سے پیشتر ہرقل نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ فلسطین' شام' ایشیائے کوچک اور مصر سے تمام یہودیوں کے اخراج کا حکم عام تھا اور ان پر جس قدر مظالم توڑے جاتے ان کی کبھی دادرسی نہ ہوسکتی تھی۔ غیر مذاہب والوں سے ہی نہیں بلکہ خود عیسائی جو اس خاص فرقہ[2] سے متعلق نہ تھے جس کا ہرقل پیرو تھا ہر قسم کے مظالم کا شکار ہوتے تھے۔ چنانچہ یعقوبی فرقہ کا ایک بطریق لکھتا ہے کہ :-

''ہرقل نے اپنی مملکت میں اعلان کر رکھا تھا کہ جو عیسائی اس کے مشرب ومسلک سے متعلق نہ ہو اس کا ناک اور کان کاٹ دیئے جائیں اور اس کا گھر بار لوٹ لیا جائے یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں کو ہرقل اپنے سامنے نہیں آنے دیتا تھا۔ لہٰذا ان کی کہیں شنوائی نہ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ خدائے جبار نے بنی اسماعیل کے گھرانے سے ایک ایسی ہستی کو مبعوث کر دیا جس نے ہمیں ظالم رومیوں کے پنجہء استبداد سے نجات دلائی۔ چونکہ ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے کسی عیسائی سے اس کے مذہب کے معاملہ میں تعرض نہ کیا۔ جو معبد کسی کے قبضہ میں تھا وہ اسی کے پاس رہنے دیا۔ اس لئے یہ تو نہ ہو سکا کہ ہمارے چند ایک گرجے جن پر Chalcedonian

1- The Eclips of Christianity in Asia-- by Laurance B. Brown-P.39.

2- Chalcedonian.

قبضہ کر چکے تھے واپس مل جاتے' لیکن ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رومیوں کے مظالم سے چھوٹ گئے اور ہمیں عربیوں کے ساتھ امن کی زندگی میسر آئی۔''[1]

یہی حالت مصر میں تھی۔ ایک آرمینین عیسائی۔ ابوصالح۔ جو تیرھویں صدی کے شروع میں ہوا ہے' لکھتا ہے :-

''یہ ایسا وقت تھا کہ شہنشاہ (قیصر) قدیم مذہب کے پرستار عیسائیوں پر بے حد ظلم وستم کرتا تھا اور انہیں زبردستی اپنے فرقہ میں داخل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ہرقل اور مقوقس کے ہاتھوں حقیقت پسند عیسائیوں نے بے حد تکالیف اٹھائیں۔ جب مظالم انتہا کو پہنچ گئے تو ملت حنفیہ کی ایک قوم اٹھی جس نے رومیوں کے نخوت وتکبر کو توڑا اور مصر کو فتح کر کے یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں کو رومیوں کے مظالم سے نجات دلائی۔''[2]

چنانچہ فتح مصر کے وقت حضرت عمر بن عاصؓ نے تمام اہل مصر کو ایک شرائط نامہ لکھ کر دیا جس کی رو سے ان کی املاک' نفوس اور اولاد سب محفوظ تھیں۔ ان کو کامل مذہبی آزادی حاصل تھی ان کے گرجے اور معبد بالکل مصئون تھے اور دشمنوں کے حملوں سے ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ تھی۔[3]

فتح دمشق کے وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے بڑے بڑے مقنن اور سیاست داں سنتے ہیں اور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ مسلم افواج دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔ ایک طرف حضرت خالدؓ تھے۔ دوسری طرف ابو عبیدہؓ۔ حضرت خالدؓ ایک رات خندق پار کر کے قلعہ کی دیوار پر چڑھ گئے۔ نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا اور مسلم فوج درانہ شہر میں گھس آئی۔ عیسائیوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو فوراً دوسری طرف جا کر چپکے سے حضرت ابوعبیدہ سے صلح کر لی۔ چنانچہ ایک طرف سے حضرت خالدؓ بحیثیت فاتح شہر میں بڑھتے چلے گئے اور دوسری طرف سے ابوعبیدہؓ بحیثیت حلیف بڑھتے آئے وسط شہر میں دونوں فریق آ ملے۔ نصف شہر بہرحال لڑائی میں فتح ہوا تھا اور اس حصہ کے ساتھ ان شرائط کے ماتحت سلوک ہونا چاہئے تھا جو بحیثیت فاتح اہل دمشق سے بعد میں طے ہوئیں۔ لیکن حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا کہ چونکہ انہوں نے اہل شہر سے صلح کر لی ہے اور وہ انہیں امان دے چکے ہیں اس لئے ان سب کو حلیف ہی شمار کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اہل شہر سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ایفائے عہد کے متعلق یونان کے مقنن اعظم سولن نے لکھا ہے ''معاہدہ مکڑی کا جال ہے جو اپنے سے کمزور کو الجھا دیتا ہے اور اپنے سے قوی کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔''

جب مسلمانوں کی افواج وادی ءجروان میں پہنچیں تو وہاں کے عیسائیوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا کہ :-

''اے مسلمانو! ہم تمہیں بازنطینی حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں۔ اس لئے کہ تم معاملہ میں ان سے کہیں بہتر ہو اور ہم سے ہمیشہ عدل و انصاف سے پیش آتے ہو اور تمہاری حکومت ان سے بدرجہا اچھی ہے کہ انہوں نے تو ہمارے گھربار ہم سے چھین لئے۔''[4]

حمص میں مسلمانوں نے کچھ عرصہ تک اپنی چھاؤنی رکھی۔ عیسائیوں کی افواج نے جب دوبارہ حملہ کیا تو حمص کے عیسائیوں نے اپنے شہر کے دروازے بند کر لئے اور ان سے کہہ دیا کہ جاؤ تم سے ان مسلمانوں کی حکومت ہزار درجہ بہتر ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو فوجی ضرورت کے ماتحت کسی دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا تو اہل شہر روتے تھے اور التجائیں

1- Chronique de Michel le Syrian--II--412. 413. 2- The Churches and Monastries of Egypt. P.30-31.
3- Preaching of Islam-- Arnold., 4- Preaching of Islam--Arnold.

کرتے تھے کہ خدا کے لئے جلدی واپس آنا کہ کہیں رومن عیسائی پھر ہم پر حکومت کرنے کو نہ آ جائیں۔[1] اللہ اللہ!

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند

اسی حمص کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ان سے سال بھر کا خراج وصول کیا۔ لیکن چھ مہینہ بعد انہیں دوسری جگہ جانا پڑ گیا تو حضرت عمرؓ نے حکم بھیجا کہ نصف خراج اہل شہر کو واپس کر دو کہ جب ان کی حفاظت ہی نہیں تو اس حفاظت کے بدلے میں خراج کیسا؟[2] کیا ایسی مثال کسی اور تاریخ میں آپ کو مل سکتی ہے؟

جبلہ بن ایہم کا واقعہ مشہور ہے کہ جب طواف کعبہ کے دوران میں اس کی چادر ایک اعرابی کے پاؤں تلے آ گئی تو اس نے اعرابی کے منہ پر طمانچہ مارا' اعرابی نے فوراً اس کا جواب ویسے ہی طمانچہ میں دیا۔ شہزادہ جبلہ نے حضرت عمرؓ کے سامنے اس کی شکایت کی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام کے نزدیک تو ایک شہزادہ اور ایک ادنیٰ دہقانی کا ایک درجہ ہے تو اس نے پھر سے عیسائی ہو جانا چاہا اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں ہمارے نزدیک تو تمہارے لئے تینوں راستے کھلے ہیں یا مسلمان رہو یا عیسائی ہو کر جزیہ ادا کرو یا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنی تیس ہزار فوج کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف چلا گیا۔[3]

سب سے بڑا الزام جزیہ کے متعلق عائد کیا جاتا ہے اور ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم رعایا سے یہ ''جرمانہ'' ان کے مسلمان نہ ہونے کے جرم کی بناء پر وصول کیا جاتا تھا۔ حالانکہ اس کی حقیقت بالکل جداگانہ ہے۔ مسلمانوں کو اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ حکومت کو ادا کرنا پڑتا تھا اور اس کے علاوہ ہر قسم کی فوجی خدمت بھی ان کے ذمہ تھی۔ غیر مسلم رعایا جو مسلمانوں کے زیر حکومت رہتی تھی ان کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمان حکومت پر لازم تھی۔ وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ اگر ان سے اس حفاظت کے اخراجات کی مد میں کچھ وصول کر لیا جائے جو مسلمانوں کی زکوٰۃ سے بھی کم تھا تو اس میں اندھیر کیا ہے؟ عورتیں' بچے' بوڑھے' اپاہج اور مذہبی رہنما اس سے مستثنیٰ تھے۔[4]

اور پھر اس جزیہ کی مقدار کتنی تھی؟ معمولی حیثیت والے سے ۱۲- سالانہ' متوسط درجہ والے سے ۸- اور اس سے آگے خواہ کوئی کروڑ پتی ہو زیادہ سے زیادہ بارہ روپے سالانہ۔ حالانکہ ایک کروڑ پتی مسلمان سے کم از کم اڑھائی لاکھ روپیہ سالانہ بطور زکوٰۃ وصول کیا جائے گا۔ صدقات و خیرات اس کے علاوہ ہوں گے اور اس مالی قربانی کے ساتھ ساتھ جب ضرورت لاحق ہو گی تو یہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں بھی شریک ہو گا اور ذمی رعایا کے مال' جان' مذہب' معابد کی حفاظت کرے گا۔ یعنی ایک ذمی رئیس بارہ روپیہ ادا کر کے نہایت اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھا رہے گا اور اسی حیثیت کا ایک مسلمان اڑھائی لاکھ روپیہ ادا کرنے کے بعد اس ذمی کے محافظ کی حیثیت سے میدان کارزار میں دشمن کی شمشیر و سنان کا مقابلہ بھی کرے گا۔ دشمن کی گولیاں ہوں گی اور مسلمانوں کا سینہ جو غیر مسلم رعایا کی حفاظت کے لئے سپر کا کام دے گا۔ مسلمانوں سے پیشتر ساسانیوں نے عیسائی رعایا پر جو ٹیکس لگا رکھا تھا وہ ساسانی رعایا سے دگنا ہوتا تھا اور اس کے جواز میں شاہ ساپر دویم نے کہا تھا کہ لڑائی ہمیں لڑنی پڑتی ہے اور یہ مزے میں بیٹھے رہتے ہیں' دگنا کیوں نہ ادا کریں؟[5] مسلمانوں کے عہد حکومت میں جب کوئی غیر مسلم فوجی خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیتا تو اس سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ چنانچہ جراجمہ کے عیسائی قبیلہ نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا۔[6] اہل حیرہ نے جزیہ دیا تو ان سے یہ شرط تھی کہ ان پر

1-2- Preaching of Islam--Arnold, .3-Eclips of Christianity., 4- Khalifs and Their Nonmuslim subjects--Tritton.,
5- Introduction to the History of the Assyrian Church--Wigram., 6- Arnold's. Preaching of Islam.

خواہ مسلمان حملہ آور ہوں خواہ غیر مسلم ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہوگی ۔[1] اور ہم حمص کے واقعہ میں دیکھ چکے ہیں کہ جب مسلمان حفاظت کی ذمہ داری سے سبک دوش ہوئے تو باقی ماندہ زرِ جزیہ ذمیوں کو واپس کر دیا۔ کیا اس کے بعد بھی یہی سمجھا جائے گا کہ جزیہ غیر مسلموں سے اسلام قبول نہ کرنے کے جرم کی پاداش میں وصول کیا جاتا ہے؟

ذمیوں کے حقوق کا مسلمانوں کو اس قدر خیال رہتا تھا کہ حضرت عمرؓ کے آخری الفاظ یہ تھے:

''میں ذمیوں کے حقوق اب اپنے جانشین کے سپرد کرتا ہوں ان کو خدا اور رسولؐ نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس لئے میرے جانشین کو خیال رکھنا چاہئے کہ جو معاہدے ان کے ساتھ ہوئے ہیں ان پر شدت سے پابندی ہو اور ان پر کسی قسم کا زائد بوجھ نہ ڈالا جائے۔[2]

حضرت عمرؓ کے خلاف بعض الزامات عائد کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے مذہب کے معاملہ میں عیسائیوں پر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں لیکن سر تھامس آرنلڈ نے (Caetin.) وغیرہ کے حوالہ سے اس کی تحقیق کی ہے کہ یہ تمام الزامات بعد کی اختراع ہیں اور ابن حزم سے پہلے ان کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس یہ واقعات بھی حضرت عمرؓ کے عہد کے ہیں کہ انہوں نے ذمیوں کے جان و مال کو مسلمانوں کے جان و مال کے برابر قرار دیا اور اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو حضرت عمرؓ اس مسلمان کو ذمی کے قتل کے بدلے میں قتل کرا دیتے۔ انہوں نے تمام زمینیں ذمیوں کے قبضہ میں رہنے دیں اور یہ حکم دے دیا کہ کوئی مسلمان کسی ذمی کی زمین کو خرید نہیں سکتا۔ ذمیوں کے علاقہ کے متعلق کوئی معاملہ پیش آتا تو انہی کے نمائندوں سے اس کے بارہ میں مشاورت ہوتی۔ قاعدہ تھا کہ جو شخص اپاہج اور ضعیف ہو جاتا اور محنت و مزدوری سے کسب معاش نہ کر سکتا تو اس کے لئے بیت المال سے کچھ وظیفہ مقرر ہو جاتا' مساوات کی یہ انتہا ہے کہ اس رعایت میں مسلمانوں کے ساتھ ذمی بھی برابر کے شریک تھے۔ چنانچہ ابن ولید نے حیرہ کے ذمیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس میں یہ شرط بھی داخل تھی۔ خلافت راشدہ کے بعد اگرچہ حکومت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی' لیکن روح اسلامی ابھی مسلمانوں میں موجود تھی چنانچہ عہد بنی امیہ اور عہد عباسیہ میں بھی ہمیں مذہبی رواداری کے درخشندہ واقعات صاف صاف نظر آتے ہیں۔ خلیفہ عمرو بن عبدالعزیزؒ نے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی گرجا کوئی صومعہ گرایا نہ جائے۔[3]

خلیفہ ہشام کے لڑکے نے ایک مرتبہ شکایت کی کہ ایک مسلمان کو ایک عیسائی نے مارا ہے۔ خلیفہ نے کہا کہ اس سے کہو کہ عدالت میں جا کر چارہ جوئی کرے۔ مسلمان اور عیسائی کی تمیز کیسی۔[4]

خلیفہ المامون کے وقت میں ایک پادری یزدان بخت دربار میں آیا' مسلمانوں سے اس نے مباحثہ کیا اور ہار گیا۔ خلیفہ نے کہا اب مسلمان ہو جاؤ۔ اس نے کہا زبردستی یا اپنی مرضی سے۔ خلیفہ نے کہا اپنی مرضی سے اس میں زبردستی کوئی نہیں۔ اس نے کہا پھر تو میں مسلمان نہیں ہوتا۔ چنانچہ خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے فوجی حفاظت میں اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے۔ مبادا کوئی نادان اسے نقصان پہنچا دے۔[5] عہد عباسیہ میں نسٹورین فرقہ کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت کا تنازع ہوگیا۔ ایک مسلمان مارا گیا جس سے مشتعل ہو کر مسلمانوں نے ان کے گرجے پر حملہ کر دیا۔ گرجے کو اتفاقیہ آگ لگ گئی۔ عیسائیوں نے مسلمان قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ چنانچہ ابو حامد اسفرائینی اور ابوبکر خوارزمی جیسے جلیل القدر مقننین کی رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ جس شخص نے گرجے پر حملہ کرنے میں سابقت کی ہے وہ مجرم

1-4-Preaching of Islam--Arnold.,

طبقات ابن سعد جس کی تائید آرنلڈ نے بھی کی ہے۔-۲

3-5 The Caliphate..... Muir.,

ہے اسے اس کے جرم کی سزا دی جائے۔[1] ان واقعات سے اس زمانہ کی عام مذہبی آزادی کا پتہ چل سکتا ہے۔

مصر میں سلطان صلاح الدین کے وقت میں عیسائی اچھے اچھے عہدوں پر متمکن تھے۔ سیکریٹری، اکونٹنٹ، رجسٹرار بالعموم عیسائی ہوتے تھے۔[2] مسٹر لارنس ای براؤن نے لکھا ہے کہ مصر میں عیسائیوں پر سوائے خلیفہ الحاکم کے عہد کے جو درحقیقت دیوانہ قرار دیا جاتا تھا کبھی ظلم وستم نہ ہوا اور جہاں کہیں عیسائیوں نے کچھ مصیبتیں اٹھائیں وہ ان کی باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے تھیں۔[3] جنگ صلیبی کے وقت بہت سے عیسائی مسلمانوں کے کیمپ میں پناہ گزیں ہو گئے اور مسلمانوں نے ان کو امان دی۔ ان میں سے کچھ تو واپس چلے گئے اور بہت سے وہیں ملازم ہو گئے اور اپنے آبائی مذہب پر بدستور قائم رہے اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا گیا۔ انہی حالات کی روشنی میں سر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ :-

> ''اگر خلفائے عباسیہ چاہتے تو جس طرح ازبلا اور فرڈی ننڈ نے ہسپانیہ سے اسلام کو خارج کر دیا تھا یا لوئس چہاردہم نے فرانس میں پراٹسٹنٹ کے عیسائی فرقہ کو مجرم قرار دے دیا تھا وہ بھی ایشیائے کوچک سے عیسائیت کو خارج کر دیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔''[4]

انہی صلیبی لڑائیوں کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ ایک سرہنگ، فرنگی فوج سے ایک شیرخوار بچہ اٹھا لایا اس کی ماں رنج وغم سے بے قرار ہو گئی اور اپنے سرداروں کے پاس جا کر روئی۔ انہوں نے کہا کہ سلطان صلاح الدین ایک سچا مسلمان ہے اس کی خدمت میں جا کر عرض کرو۔ وہ روتی ہوئی آئی اور اپنی داستان سنائی۔ سلطان یہ کہانی سنتا جا رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ اپنی کہانی ختم کر چکی تو سلطان غصہ سے کانپ رہا تھا۔ خود اٹھا، ساری فوج میں تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ بچہ بچ دیا گیا ہے۔ اس کے دام ادا کر کے بچہ کو واپس منگایا اور اس کی ماں کی گود میں دے دیا اور سوار کرا کے عزت کے ساتھ واپس پہنچا دیا۔

جس زمانہ میں سلطان رملہ کے متصل خیمہ زن تھا یا فا میں انگلستانی بادشاہ رچرڈ بیمار پڑا۔ رچرڈ کے پاس اس وقت صرف دو تین سو سپاہی تھے۔ سلطان نے حکم دیا کہ بیمار دشمن پر حملہ کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ رچرڈ کے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ سلطان اسے روزانہ برف اور میوہ بھیجتا تھا اور بعض مورخ تو لکھتے ہیں کہ سلطان خود طبیب بن کر اسے دیکھنے گیا اور اس کا علاج بھی کیا۔

جب فرنگی بیت المقدس میں سلطان کے محاصرہ سے تنگ آ گئے تو امان کے طالب ہوئے اس نے امان دے دی اور کہا کہ تمام فرنگی چالیس دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیں۔ جب اسلامی فوج شہر میں داخل ہوئی تو سپاہیوں نے دیکھا کہ فرنگی اشرفیوں کے صندوق بھرے لئے جا رہے ہیں سلطان سے جا کر کہا کہ فاتح فوج ایسی غنیمت سے کیوں محروم کی جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ درست ہے لیکن بدعہدی ہمارا شیوہ نہیں۔

سلطان مراد ثانی کے مقابلہ میں جب صلیبی لشکر ہونیاد کی قیادت میں جو کیتھولک تھا میدان قوصوہ میں صف آرا تھا اس وقت ہونیاد کے ساتھی سلطان سربیا نے اس سے پوچھا کہ اگر تم کو فتح حاصل ہو گئی تو کیا کرو گے؟ اس نے کہا کہ سب کو کیتھولک بنا کر چھوڑوں گا۔

لیکن جب یہی سوال سربیا نے مراد کے پاس بھیجا تو اس نے جواب میں لکھا کہ میں اگر کامیاب ہوا تو ہر مسجد کے پہلو میں ایک ایک کنیسہ بنانے کی اجازت دے دوں گا تا کہ جس کا جی چاہے مسجد میں آئے جس کا جی چاہے کنیسہ میں جائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ سربیا نے ہونیاد کا ساتھ چھوڑ دیا

1-3-Eclips of Christianity., 4-Preaching of Islam--Arnold.,

جس کی وجہ سے صلیبیوں کو شکست اٹھانی پڑی۔

ایک بار ایک عثمانی مفتی سے کسی نے سوال کیا کہ اگر دس مسلمان ایک یہودی یا عیسائی ذمی کے قتل میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قصاص میں مارے جائیں گے۔ مفتی نے جواب دیا کہ بے شک دس نہیں ایک ہزار بھی۔

اگر چہ یہ شہادتیں تاریخی اعتبار سے کچھ کم وقیع نہیں لیکن عہدِ اسلامی میں غیر مسلم رعایا کی حالت کے متعلق کچھ ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن پر کسی خارجی اثر' یک طرفہ میلان و رجحان یا کسی دباؤ کا امکان نہیں ہوسکتا۔ اس زمانے کے بعض عیسائی بطریق اور دیگر پادری اپنے اسقف وغیرہ کو خفیہ خطوط لکھتے رہتے تھے۔ اتفاق سے ان میں سے بعض خطوط دست یاب ہو گئے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی رعایا فی الواقع مسلمانوں کے عہدِ حکومت سے مطمئن اور خوش تھی' ورنہ ظاہر ہے کہ اگر انہیں کچھ بھی تکلیف ہوتی تو وہ اس کو بڑھا چڑھا کر کیوں نہ لکھتے۔ ہم ان خطوط میں سے بعض کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بطریق ایشوب سویم دیوار و شیر (فارس) کے سامین کے نام ایک خط کے دوران میں لکھتا ہے:-

''یہ طے یا عرب جن کو خدا نے اس زمین کی حکومت عطا کی ہے آپ کو علم ہی ہے کہ اب ہمارے پاس رہتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی ہمارے مذہب پر حملہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ہمارے مذہب کی عزت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور خدائے مسیحی کے اولیاء کی تعظیم کرتے ہیں' اور کلیساؤں اور خانقاہوں پر ان کی طرف سے الطاف واکرام کا سلوک کیا جاتا ہے۔''[1]

چوں کہ اس بطریق کا زمانہ قریباً ۶۴۷ء لغاتیہ ۶۶۰ء ہے اس لئے مصرحہ بالا خط حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کے عہدِ حکومت میں لکھا گیا ہوگا۔ یروشلم کے فرقہ مالکی کا ایک بطریق قسطنطنیہ کے بطریق کے نام ایک خط میں رقم طراز ہے:-

''مسلمان عادل ہیں اور ہم سے نہ کوئی بے انصافی کرتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی زیادتی روا رکھتے ہیں۔''[2]

اسی طرح نزبن کے میٹروپولیٹن الیاس نے ۹۔۱۰۰۸ء میں لکھا ہے:-

''مسلمانوں کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی اطاعت اور محبت دیگر مذاہب کے لوگوں کی اطاعت سے زیادہ ہم کو متاثر کرتی ہے خواہ ہم ان کی رعایا ہوں یا نہ ہوں اور خواہ وہ ہم سے کیسا ہی سلوک کیوں نہ کریں اور یہ اس لئے کہ مسلمان اسے اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں کہ ہماری حفاظت کریں اور ہم سے نیک سلوک کریں اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان میں سے جو کوئی غیر مذہب والے کو ستائے گا نبی اکرم صلعم قیامت کے دن اس مسلمان سے مواخذہ کریں گے۔[3] ان کا قانون ہمارے حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔ اور ہمیں دیگر مذاہب سے متمیز قرار دیتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی مسلمان نے جب کبھی ہم سے زیادتی کی ہے تو اس کے قانون نے اسے بتا دیا ہے کہ اس نے یہ ناجائز کام کیا ہے۔ برعکس اس کے دوسرے مذاہب کے متبعین میں سے کسی نے اگر ہماری عزت کی ہے یا ہم سے نیک سلوک کیا ہے تو اسے اس کے قانون نے بتایا ہے کہ اس نے یہ اچھا کام نہیں کیا لہٰذا مسلمانوں نے اگر کہیں ہم پر زیادتی بھی کی ہے تو ان کے اس اعتراف کی بنا پر کہ انہوں نے یہ مستحسن کام نہیں کیا ان کی زیادتی ہمارے لئے دیگر اہل مذاہب کے حسن سلوک سے کہیں بہتر ہے کہ جس سلوک کی بناء

1-Eclips of Christianity. Assernanj III,Pt.II., 2- Boehier-P.31.,

3- یہ ابوداؤد کی ایک حدیث کی بناء پر ہے (پرویز)

پر ان کے قانون نے انہیں بتایا کہ انہوں نے یہ برا کام کیا ہے'' ۔[1]

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ غیر مسلم رعایا مسلمانوں کے عہد حکومت اور ان کے اصولوں کو کس قدر نعمت الٰہی سمجھتی تھی اور ان کو کس قدر اطمینان اور آزادی حاصل تھی ۔ برعکس اس کے اس زمانے میں جہاں کہیں مسلمان عیسائی حکومت میں آباد تھے ان پر انتہائی مظالم توڑے جاتے تھے ۔ ابی سینیا میں شاہ سیفا آراد نے حکم عام دے رکھا تھا کہ تمام ملک میں جتنے مسلمان ہیں یا تو عیسائی ہو جائیں یا ملک بدر کر دیئے جائیں یا جہاں ہوں وہیں قتل کر دیئے جائیں ۔[2]

حالانکہ یہ وہ ابی سینیا ہے جو مسلمانوں کی وسعت ظرف کے صدقے میں عیسائیوں کے قبضے میں رہا تھا- نجاشی نے مسلمانوں کے سب سے پہلے مہاجرین کے قافلے کو سات آٹھ سال تک اپنے ہاں پناہ دی تو مسلمانوں نے اس احسان کا بدلہ اس انداز سے دیا کہ سات آٹھ سو سال تک جب کہ چین سے لے کر مراکش تک اسلامی پرچم لہراتا رہا حبش کی عیسائی سلطنت میں جو ایک مختصر سے قطعہ ارض پر مشتمل تھی ۔ کبھی دخل انداز نہ ہوئے درآں حالیکہ نجاشی اول کا جانشین ہی مسلمانوں کے مخالف ہو گیا تھا اور ۹ھ میں ایک دستہ فوج لے کر جدہ تک چڑھ آیا تھا- نبی ءاکرمؐ نے بجائے جنگ کرنے کے اس سے صلح کا برتاؤ کیا اور نجاشی کے احسان کے بدلے میں مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ

سالمو الحبشة ماسالمتكم

جب تک اہل حبش تم سے مصالحت رکھیں تم بھی ان سے مصالحت رکھنا ۔

یہ تو تھا مسلمانوں کا طرز عمل حبش کے عیسائیوں کے ساتھ لیکن اسی حبش کا خود اٹلی کے عیسائیوں کے ہاتھوں کیا انجام ہوا دنیا اس پر شاہد ہے ۔

اسپین میں جب مسلمان داخل ہوئے تو وہاں کی عیسائی سلطنت کے ماتحت یہودیوں پر ایک قیامت برپا تھی ۔ انہوں نے یہودیوں کو ان کے پنجہء استبداد سے چھڑایا اور خود عیسائیوں کو ان کے مذہب میں کامل آزادی عطا کی ۔ وہ اپنے معاملات کا تصفیہ اپنے قاضیوں سے کراتے ۔ ہر قسم کے مذہبی تیوہار مناتے' نئے گرجے بھی تعمیر کرتے ۔ آخری زمانہ میں عیسائی مذہبی جوش میں قرطبہ کے بازاروں میں آکر رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی برتتے ۔ لیکن اسلامی حکومت کی طرف سے سزا صرف انفرادی مجرم کو دی جاتی ۔ اس کے ہم مذہب دیگر افراد سے کوئی باز پرس نہ ہوتی اور تمام عیسائی رعایا امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتی ۔[3] فتح قسطنطنیہ کے وقت ایک روسی مورخ کا بیان ہے کہ ''عیسائیوں کے مظالم سے غریبوں پر خدا کی دنیا تنگ ہو چکی تھی ۔ مسلمان اس کے خرمن استبداد پر برق خاطف بن کر گرے ۔ ان کے منصف اپنی امانتوں میں کبھی خیانت نہیں کرتے تھے ۔ [4]

فارس میں آتش پرستوں کے معبد بالکل محفوظ رہے ۔ دسویں صدی یعنی فتح ایران کے تین سو سال بعد تک کے مؤرخین کے بیان کے مطابق عراق' فارس' کرمان' خراسان' آذربائیجان میں آتشکدے موجود تھے ۔ المعتصم کے عہد میں ایک جرنیل نے ایک امام مسجد اور مؤذن کو دروں سے پیٹا کہ ان کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک پرانے آتشکدے کو مسجد میں تبدیل کرانا چاہتے تھے ۔ شیراز میں گیارھویں اور تیرھویں صدی تک غیر مسلم رعایا کے تیوہاروں کی تقریب میں شہر کے بازار آراستہ کئے جاتے اور یہ تیوہار بڑی دھوم سے منائے جاتے ۔ [5]

اسلام کی تعلیم کا کچھ ایسا تحیر انگیز اثر ہے کہ وہ گویا انسان کی فطرت ہی بدل دیتی ہے ۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے چغتائی اور منگول قبائل تاریخ عالم میں وحشت و بربریت

1-The Eclips... 2-, Preaching of Islam., 3-Arnold's, 4- Karamsin-- Vol.V.P.43.,
5-The Caliphs and their Non-Muslim subjects-P.107.

کے مجسمے تصور کئے جاتے ہیں ہر زبان میں ان کا نام آتش و خون کے حروف میں لکھا جاتا ہے۔ اس سے ان کے مذہبی تعصب وجنون کا اندازہ لگا لیجئے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے عہدِ حکومت میں یہ حکم عام تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے طریق پر کوئی جانور ذبح کرے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اسے قتل کر دے۔ لیکن یہی قبائل جب اسلام کے آغوش میں آئے تو ان کی مذہبی رواداری کی یہ کیفیت تھی کہ ازبک خاں نے پیٹر کے اسقف' کے نام ۱۳۱۳ء میں ایک منشور لکھا جس میں درج تھا کہ کوئی شخص حدود سلطنت کے اندر کسی عیسائی کے گرجا کو نقصان نہ پہنچائے گا۔ اس کی جائیداد نہیں چھینے گا اور اس کے مذہب سے قطعًا تعرض نہیں کرے گا جو ایسا کرے گا۔ وہ حکومت کی جانب سے سزا کا مستوجب ہوگا اور اپنے خدا کے حضور اس کا جواب دہ۔''[1]

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہندوستان کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے لکھنا تحصیل حاصل ہے یہاں مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں مذہبی رواداری کا زندہ ثبوت خود یہاں کی مردم شماری ہے۔ ہندوستان میں قریب ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے حکومت کی اور اس میں ایسے ایسے وقت بھی آئے کہ کشمیر سے میسور تک اور گجرات سے بنگال تک ایک ہی مسلمان بادشاہ کا سکہ رواں تھا لیکن بایں ہمہ سلطنت مغلیہ کے اختتام پر مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے کم تھی۔[2] اور جب ''تلوار'' ہاتھ سے نکل گئی تو اس اسی (80) سال کے عرصہ میں وہ تین گنا ہوگئی۔ ان اعداد وشمار سے اگر وہ تعداد خارج کر دی جائے جو غیر ہندی مسلمانوں اور ان کی اولاد پر مشتمل ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ ہندوستان میں کس قدر اسلامی مبلغ آئے اور انہوں نے غیر مسلم باشندوں کے دلوں میں کس قدر گہری عقیدت پیدا کر لی تو شمشیر بچاری کے حصہ میں سوائے بدنامی کے اور کیا رہ جاتا ہے۔

سب سے پہلے حجاج کے عہد میں غازی محمد بن قاسم کی زیر قیادت مسلمان سندھ میں آئے۔ سر ولیم میور لکھتا ہے کہ ''اس وقت مسلمانوں نے ہندوؤں کے تمام مندر اسی طرح رہنے دیئے' ان کو بت پرستی سے بہ جبر نہیں روکا۔ یہود' نصاریٰ' پارسی سب کو اجازت تھی کہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اسلامی حکومت کے ہندوستان غیر مسلم ہی رہا۔''[3] محمود غزنوی کے حملے مسلم جور واستبداد کے لئے بطور ضرب المثل استعمال کئے جاتے ہیں لیکن انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا عیسائی مدیر ان تمام حملوں کے تذکرہ کے بعد لکھتا ہے کہ :-

> ''محمود نے مذہب کے بارے میں کہیں زبردستی نہیں کی بلکہ کئی جگہ اس نے اپنے اہل مذہب پر ہندوؤں کو ترجیح دی''۔

اسی طرح لالہ تلسی رام صاحب اپنی کتاب ''واقعات ہند'' میں لکھتے ہیں :-

> ''محمود نے بہ جبر کسی کو مسلمان نہیں بنایا نہ کسی ہندو کو اس لئے قتل کیا کہ وہ ہندو ہے''۔

ڈاکٹر بریز اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں :-

> ''مسلمانوں کی تدبیر مملکت کا یہ ایک جزو ہے کہ وہ ہندوؤں کی خصوصیات میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ان کے مذہبی رسوم کو بجالانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں۔''

اکبر کے عہد میں یہ رواداری تو گویا جانب داری کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ راجہ مان سنگھ کو مثلاً وہ اقتدار حاصل تھا جو شاید پرتھوی راج کو بھی نصیب نہ ہوا ہو۔ راجہ ٹوڈرمل وغیرہ کی قدر ومنزلت کسی صورت میں بکرماجیت کے نورتنوں سے کم نہ

1-Arnold's., 3-The Caliphate... p.363.,

۲۔ ڈاکٹر ہنٹر کے ایک بیان کی رو سے جب ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں گئی تو مسلمان کل آبادی کا دسواں حصہ تھے اور گورنمنٹ آف انڈیا کی مردم شماری کی رپورٹ بابتہ ۱۸۸۱ء کی رو سے مسلمان کل آبادی کا پانچواں حصہ۔ یعنی ۵ کروڑ۔ لیکن ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۹ کروڑ (پرویز)۔

تھی۔ مذہبی آزادی کے متعلق رائے بہادر لالہ بیج ناتھ اپنی کتاب ''ہندوستان گذشتہ وحال'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

''مسلمان فرماں رواؤں کی نسبت یہ اعتراض بھی پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے عہد میں نئے مندر بننے کی اجازت نہ تھی لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ دہلی، آگرہ، متھرا وغیرہ میں جو اسلامی قوت وسطوت کے خاص مرکز تھے۔ بہت سے مندر شاہان اسلام کے عہد کے تعمیر شدہ اس وقت تک موجود ہیں۔''

اورنگ زیب کے تو نام سے ہی ایک خونچکاں منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کم از کم اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جب تک سوا من زنار نہیں اتروالیتا تھا۔ کھانا نہیں کھایا کرتا تھا۔[۱]

لیکن تاریخ کے ان صفحات کو کہاں لے جایئے جن پر ثبت ہے کہ :

''اورنگ زیب کو خبر پہنچی کہ بنارس کے بعض حکام برہمنوں کو ستاتے ہیں تو اس نے ابوالحسن گورنر بنارس کو فرمان بھیجا کہ ہماری شریعت کا حکم ہے کہ مندر نہ ڈھائے جائیں اور ان کے پجاریوں پر سختی نہ کی جائے لہٰذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی برہمن یا ہندو پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالے۔''[۲]

اسی طرح بابو رام نرائن صاحب منیجر ریاست رام نگر اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

''ضلع سیتا پور میں مصرکہ کے مندر کو عالمگیر نے چند مواضعات جاگیر میں دیئے جو اب تک موجود ہیں۔ نیز متھرا کے نزدیک بلدیو راؤ کے مندر کو بہت سے گاؤں جاگیر میں دیئے''۔

بابو منوہر لال صاحب اوہری اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں :-

''اورنگ زیب نے مندروں کو جاگیریں دیں اس کے بڑے بڑے عہدہ دار ہندو تھے''۔

پروفیسر ایشوری پرشاد صاحب اپنی ''تاریخ ہند'' میں لکھتے ہیں :-

''ملتان میں توتلہ مائی کے مندر کو ایک سو روپیہ سالانہ جاگیر عالمگیر نے عطا فرمائی۔ ڈیرہ دون کے گوردوارہ کو جاگیر دی۔ ہندوؤں پر سے محصول جاترہ جو پہلے سے چلا آتا تھا موقوف کر دیا۔''

سکھ حضرات کے ہاں تو ''اورنگا'' کے مظالم کی داستانیں ہر تقریب پر دہرائی جاتی ہیں اور ان میں گورو گوبند سنگھ جی کے واقعات کو سب سے زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے لیکن رائے بہادر کنھیا لال اپنی ''تاریخ پنجاب'' میں لکھتے ہیں :-

''گورو گوبند سنگھ جی نے محاصرہ کے بعد اورنگ زیب کو فارسی میں عرضی لکھی کہ میں سیاست سے الگ ہو کر عبادت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں بادشاہ نے لکھا کہ اگر ایسا ہے تو آپ سے کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ اس نے تمام حکام کو اس کے مطابق احکام جاری کر دیئے۔''

متاخرین میں سے حیدر علی اور سلطان ٹیپو بھی اس بارے میں بہت بدنام کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے بہت سے ہندو خاندانوں کو مسلمان کر لیا ان کے متعلق سر تھامس آرنلڈ لکھتے ہیں کہ :-

''یہ تحقیق سے ثابت ہے کہ ان خاندانوں کا مسلمان ہونا ان بادشاہوں کے عہد سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔''

اسی حیدر علی کے دو وزیر برہمن تھے اور شاما برہمن اس کا معتمد خاص تھا۔[۳]

ملوکوٹہ میں جو وشنو کا مندر ہے اس میں دو چاندی

۱۔ اگر ایک زنار کے تاگہ کا وزن ایک تولہ بھی فرض کر لیا جائے تو گویا ۴۰۰۰ ہندو ہر روز مسلمان کئے جاتے تھے یا قتل کرا دیئے جاتے تھے۔ اب اندازہ فرمایئے کہ اس کے پچاس سالہ عہد حکومت میں کس قدر ہندو مسلمان ہوئے یا قتل کئے گئے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے مگر کہ زندہ کنی خلق را وبازکشی ۔۔۔ کا اعجاز معشوقانہ آتا ہوگا۔ یاللعجب۔ منہ

۲۔ ''بنارس سٹی'' مصنفہ نرنجن سیلن صاحب۔ بی۔اے۔ ایل ایل بی۔ وکیل۔ ۳۔ سوانح عمری حیدر علی۔ از ڈپٹی لال نگم۔

کے برتن ہیں جن پر یہ عبارت کندہ ہے۔

''یہ برتن ٹیپو سلطان کی طرف سے بطور ہدیہ مندر کو دیئے گئے۔''

ان واقعات کے دہرانے سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ان مسلمان فرماں رواؤں کی وسعت نظر اور کشادہ دلی کے قصائد لکھے جائیں بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ ان کے عہدِ حکومت میں اسلامی کلچر اسلامی روایات اور اسلامی تعلیم کے کچھ نہ کچھ آثار باقی تھے۔ اس لئے ان کا تقاضا تھا کہ غیر مذاہب والوں سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے۔ تاریخ کے یہ صفحات آپ کے سامنے ہیں غیر مسلم مصنفین کی شہادتیں موجود ہیں ان کی روشنی میں مسلمانوں کے عہدِ حکومت پر نگاہ ڈالئے خواہ وہ عرب میں ہوں یا عجم میں، چین میں ہوں یا ترکستان میں، مصر میں ہوں یا ہندوستان میں۔ چونکہ قرآن کریم کی تعلیم کا تقاضا تھا کہ کسی شخص پر محض اختلاف مذہب کی بناء پر کوئی زیادتی نہ کی جائے اس لئے کسی کا ذاتی رجحان اور طبعی میلان کچھ ہی کیوں نہ ہو جب وہ قرآن کریم کو سامنے رکھ لیتا تھا تو عدل وانصاف سے اعراض نہیں کرسکتا تھا۔ جب عام مسلمانوں کی سلطنت میں غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کی مذہبی رواداری کا عملی ثبوت دیا جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ جب دنیا میں صحیح معنوں میں خدا کی بادشاہت قائم ہو جائے تو اس وقت تمام نوع انسانی کو کس قدر آزادیء مذہب اور حریت فکر حاصل ہوگی۔ غیر مذاہب کے حضرات اگر ان واقعات پر غور وفکر کی نگاہ ڈالیں تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ اسلام کا دامن ان تمام خونی دھبوں سے پاک ہے جو اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کو امن وسلامتی کا پیغام دینے والا ہے اور کسی حالت میں بھی رشتہء عدل وانصاف کو ہاتھ سے چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے خدا کا اعلان ہے کہ

لا یجرمنکم شنان قوم علی الاتعدلوا اعدلوا ھوا قرب للتقوی۔
〈۵/۸〉

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان سے عدل نہ برتو۔ عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

اور انہی واقعات کو دیکھنے کے بعد ایک عیسائی مصنف یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ :-

''تاریخ (کے واقعات) جو ہم نے اس کتاب کے صفحات پر بے نقاب کئے ہیں ظاہر کر رہے ہیں کہ اسلام ایشیاء کے عیسائیوں سے ''بزور شمشیر'' نہیں منوایا گیا۔ بلکہ اس کی اشاعت مسلمانوں کی روز افزوں ترقیوں کی وجہ سے ہوئی۔''[1]

برعکس اس کے

''صلیبی لڑائیاں لڑنے والوں کے دل میں سب سے پہلے آرزو یہ تھی کہ وہ جناب مسیح کے لئے بزور شمشیر ایک سلطنت حاصل کرلیں۔''[2]

1-2-The Eclips of Christianity in Asia., PP.183-184 & 143.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

سامری نے بچھڑا بنایا

ہم نے فرقہ بندی کا سانڈ بنالیا

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ابتر کر دی گئی۔ ان کے لئے تعلیم حاصل کرنے کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ بے شمار تعلیمیافتہ مسلمان افراد کا قتل عام کر دیا گیا اور ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ جن لوگوں نے اس لڑائی میں انگریز حکومت کا ساتھ دیا تھا انہیں بڑی بڑی جاگیریں بخشش کے طور پر عنایت کی گئیں۔ پاکستان میں موجودہ بے حد وحساب زمینوں کے مالک اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ برٹش دور حکومت میں زندگی کے ہر میدان میں ہندوؤں کو مسلمانوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ تمام اچھے اچھے عہدے ہندوؤں کو سونپے جاتے تھے۔ اس کی ایک وجہ انگریزی تعلیم کا فقدان بھی تھا۔ آفس میں انگریز یا ہندو آفیسر ہوا کرتا تھا اور ان کے لئے مسلمان پنکھا جھولا کرتا تھا اور باہر دروازے پر چپڑاسی بھی مسلمان کھڑا رہتا تھا محکمہ ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر ہندو اور سگنل چینج کرنے کے لئے مسلمان، تجارت بھی ہندو کے ہاتھ میں تھی۔ اسٹیشن پر مال لالہ جی کا آرہا ہے اور دوکان میں پہنچانا مسلمان قلی (مزدور) کی ذمہ داری، گاؤں سے مسلمان کاشتکار پھل، سبزیاں، گیہوں، مکئی، چنے، کپاس، گنا، گڑ، شکر اور چاول منڈی میں لایا کرتا تھا کیونکہ سرکار نے آبیانہ (مالیہ) جو اس کے ذریعے وصول کرنا ہوتا تھا۔ علاقہ کی دیکھ بھال کے لئے تھانیدار سکھ اور مسلمان جانباز سپاہی، شہر میں جان اور مال کی حفاظت کے لئے گرمیوں اور سردیوں کی راتوں میں خان چچا چوکیدار پہرہ دیا کرتا تھا اور سیٹھ جی بغیر کسی خوف وخطر سُکھ کی نیند سویا کرتے تھے۔ یہ ہے مختصر سا خاکہ جس میں آپ نے دیکھا کہ جتنے عزت والے کام ہوا کرتے تھے وہ ہم مسلمانوں کو دیئے جاتے تھے۔ ارے کیا ٹھاٹھ تھی ہماری ہندوستان میں؟ سوال یہ ہے کہ ایسی سکیم کیوں اختیار کی گئی؟ صرف اور صرف اس لئے کہ اس سرزمین میں کہیں شرع پیغمبر آشکارانہ ہونے پائے۔ انگریز اور ہندو جانتا تھا (اور جانتا ہے) کہ دین اسلام قائم ہو جانے کے بعد ملوکیت (چاہے کسی بھی شکل میں ہو) سرمایہ داری، جاگیرداری اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جایا کرتا ہے۔ جس کے ذریعے ہر قسم کے لیڈران کرام بغیر محنت کئے دوسروں کی کمائی پر عیش وآرام اور تن آسودگی کی زندگی بسر کئے چلے جاتے ہیں۔

1871ء میں ولیم ہنٹر اپنی کتاب انڈین مسلم میں لکھتا ہے کہ اب مسلمانوں سے آہستہ آہستہ چھوٹے بڑے تمام عہدے چھین لئے گئے ہیں اور ان کو بہشتی، لکڑہارے بنا کر، چپڑاسی اور آفسز

میں پَین مرمت کے کام سونپ دیئے گئے ہیں..... یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں سے اس قوم کے بہی خواہ سرسید احمد خان اٹھے اور انہوں نے اس قوم کو پستی سے نکالنے کی خاطر علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی تا کہ مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ دیوبند فرقہ والوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے عین بالمقابل اپنا مدرسہ کھول کر سرسید کی مخالفت شروع کر دی اور ان کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر کے ان کو نیچری کہنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کے لئے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنا ناجائز قرار دے دیا گیا کیونکہ یہ مولوی صاحبان کا فرمان تھا اس لئے اس کا اثر کافی عرصہ بلکہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد چند سال تک رہا (اس پراپیگنڈہ کا اثر اس ناچیز پر بھی ہوا کیونکہ انسانوں کے وضع کردہ مذہب کی افیم کھائی ہوئی تھی۔ میں نے اس ملک میں آنے سے پہلے دو سال انگلش پڑھی تھی) سرسید کے علاوہ دوسرے مسلمان راہنماؤں نے بھی بھانپ لیا تھا کہ اگر حالات ایسے ہی رہے تو اس ملک سے اسلامی تہذیب کے معدوم ہونے کا خطرہ بعید از امکان نہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہمیں علامہ اقبال کے تصور اور قائداعظم کی راہنمائی میں 23 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے جلسہ میں قرارداد پاکستان پاس کرنے کی توفیق عطا فرما کر مسلسل جدوجہد اور عظیم قربانیاں دینے کے بعد بالآخر 14 اگست 1947ء کو پاکستان کی نعمت سے نوازا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی آئین پاکستان میں قرارداد مقاصد شامل کی گئی جس میں واضح طور پر کہا گیا کہ خدائی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے آئین اور آئین کو نافذ کرنے کے لئے ایک آزاد خطہ زمین کی وراثت چونکہ لازمی امر ہے اس لئے یہی نظریہ نظریۂ پاکستان کی بنیاد قرار پاتا ہے..... یہ عجب اتفاق ہے کہ قرآن کریم کی سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 44 کا آخری حصہ جس کی مزید تاکید اسی سورۃ کی آیت نمبر 45 اور 47 کر رہی ہیں۔ ''جو لوگ خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ (حکومت) نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں'' (5/44) جو لوگ خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ (حکومت) نہیں کرتے وہی تو ظالم ہیں (5/45) جو لوگ خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ (حکومت) نہیں کرتے وہی تو فاسق ہیں (5/47) کما حقہ اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں۔ اللہ نے اپنے قانون کے مطابق مومنین صالحین کو زمین کا وارث قرار دیا ہے (21/105) ,(24/55)۔ کچھ عجب نہیں کہ جونہی مسلمانوں نے پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کا نعرہ لگایا اسی لمحہ مالکِ ارض وسما نے اپنی زمین کے ایک ٹکڑے کا ان کو وارث ہونا مقدر کر دیا ہو۔ یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ قرآنی نظام کے نفاذ کے لئے رسول اکرم ﷺ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا پڑی اور رمضان کے مہینہ میں جنگ بدر میں فتح حاصل کر کے اسلامی حکومت کی پہلی اینٹ رکھی اور اسی نظام کے نفاذ کے لئے رمضان کے مہینہ میں مسلمانوں کو ہند سے ہجرت کرنا پڑی۔ قائدؒ ہم سے رخصت ہوئے یاروں نے نعرہ پس پشت ڈالا خدا کو دھوکہ دے دیا (2/9) موسیٰ کی غیر حاضری میں سامری نے ایک بچھڑا بنایا۔ قائدؒ کے بعد ہم نے مختلف رنگوں کے کئی بچھڑے بنا ڈالے۔ جن میں سب سے بڑا سانڈ فرقہ بندی کا شرک ہے (30/32) جو نا قابل معافی ہے (4/48)۔ سورۂ توبہ کی آیت نمبر 52-55 میں اسلام کے قیام و استحکام کے سلسلہ میں جہاد میں شرکت سے جی چرانے والے کلمہ گو منافقین کو فاسقین و کافرون کہہ کر ان کا مآل اس دنیا میں عذاب بتایا گیا ہے۔ المائدہ کی مذکورہ بالا آیات کو ملانے سے ایسا لگتا ہے کہ یہ ہمارا ہی ذکر ہے۔ عذاب کی ایسی کونسی شکل ہے جس میں پاکستانی مبتلا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صاحبزادہ انوار الحق وفا

آخر قصور نکل ہی آیا

(سرسید اور کائناتی مفکر ملاؤں کی بے جا تنقید کی زد میں)

ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ مئی جون 2003ء میں ایک دلچسپ بحث پڑھنے کو ملی جس میں محترم عطاء الحق قاسمی نے لکھا کہ: ''میرا ذاتی موقف یہ ہے دینی تعلیم دینے والے اور دنیاوی تعلیم دینے والے دونوں طبقے صرف ''ضرورت صورت'' کے عالم اور دانشور پیداوار کر سکے ہیں۔ دینی مدرسوں سے کوئی رازی اور کوئی غزالی ابھر کر سامنے نہیں آیا اور دنیاوی مدرسے ہمیں کوئی آئین سٹائن کوئی نیوٹن نہیں دے سکے۔ دونوں نے بس ''غریبی دعوے'' والا کام کیا ہے۔''

پہلی بات تو یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی کو تقابل کرنا بھی نہیں آیا دو مسلمانوں رازی اور غزالی کے مقابلہ میں دو غیر مسلموں آئن سٹائن اور نیوٹن کو پیش کر رہے ہیں اگر یہ تقابل کرنا ہی تھا تو یوں کرتے دینی مدرسوں سے کوئی غزالی اور جیلانی ابھر کر سامنے نہیں آیا اور دنیاوی مدرسے ہمیں کوئی رازی اور ابن سینا نہیں دے سکے۔ قاسمی کو تو یہ بھی علم نہیں کہ رازی دینی مدرسے کی پیداوار نہیں تھے۔ قاسمی کے علم میں یہ بات بھی نہیں غزالی جیسے صوفی دینی مدرسوں میں کم اور خانقاہوں میں زیادہ پلتے ہیں۔ میں نے قاسمی کے جملے کی رعایت کرتے ہوئے دو صوفی غزالی اور جیلانی اکٹھے کر دیئے ہیں جن کی کتب نسخہ کیمیا اور غنیۃ الطالبین پڑھ کر ان کی علمیت کا بھید کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ بات برصغیر کی ہو رہی تھی بہتر ہوتا اگر قاسمی ایک طرف اشرف علی تھانوی' احمد رضا خان بریلوی اور دوسری طرف سرسید احمد خان' عنایت اللہ مشرقی کے نام پیش کرتے۔

رئیس التحریر الشریعہ محترم زاہد الراشدی کہتے ہیں۔ ''جب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے ہمارا پورا نظام تلپٹ کر دیا تھا۔ دینی مدارس ختم کر دیئے تھے۔ تب دو طبقے سامنے آئے تھے اور انہوں نے ملت کو سہارا دیا تھا۔ دونوں نے الگ الگ شعبوں کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ علماء کرام نے قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور اسلامی ثقافت اور تہذیب کے تحفظ کا وعدہ کیا تھا۔ ایک اور طبقہ سامنے آیا جس نے قوم کو جدید علوم

سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھانے کا وعدہ کیا۔ انگریزی اور جدید زبانوں کی تعلیم اپنے ذمے لی۔''

پہلی بات تو یہ ہے کہ راشدی نے اقرار کرلیا کہ دونوں طبقوں نے ملت کو سہارا دیا تو جھگڑا کس بات کا رہ گیا۔ لیکن افسوس دوسری جانب وہ دنیاوی مدرسوں پر یہ الزام بھی لگا رہے ہیں کہ ''وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں آج کی قوموں کے برابر نہ لا سکے اور آج اپنی ناکامی کی ذمہ داری مولوی کے سر تھوپ کر اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' اس سلسلہ میں پہلی گزارش یہ کہ دینی اور دنیاوی علوم کی تقسیم جو عطاء الحق قاسمی اور زاہد الراشدی نے کی ہے یہ کہاں جائز ہے؟ محترم انصر رضا آف ٹورنٹو کینیڈا نے درست کہا کہ ''یہ عجیب بات ہے کہ اقتدار کا مسئلہ ہو تو سیاست دین سے الگ نہیں ہوسکتی لیکن سیکھنے کی بات ہو تو مشکل علوم کا بوجھ عامتہ الناس کے کندھے پر ڈال کر خود حلووں پر راضی ہوجائیں۔''

دوسری گزارش یہ ہے کہ زاہد الراشدی کے اس الزام کہ ''وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں آج کی قوموں کے برابر نہ لا سکے۔'' سراسر حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ تنظیم اسلامی کے ناظم نشرواشاعت ڈاکٹر عبدالخالق جو آپ ہی کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اقرار کر رہے ہیں کہ ''جہاں تک عام مروجہ تعلیم کا تعلق ہے اس کے ذریعے مروجہ حکومتی نظام چلانے والے کارندوں کی ضرورت ہے جو بحسن خوبی پوری ہو رہی ہے۔ جہاں تک عام ٹیکنیکل علم ومہارت کا تعلق ہے اس میں تو ہمیں کوئی کمی نہیں ہے۔ ہاں البتہ جہاں تک جدید ٹیکنالوجی اور اس میں تحقیق اور ایجادات اور اس میں مہارت کا تعلق ہے قریباً تمام ہی مسلمان ممالک اس میں ''پھسڈی'' ہیں۔ صرف ایک استثناء ہے کہ پاکستان نے کم ازکم ایٹمی ٹیکنالوجی میں تو وہ ترقی کی ہے جس کا اعتراف ہمارا دشمن اور مغرب بھی کرنے پر مجبور ہے۔'' زاہد الراشدی ذرا غور کریں کس طرح آپ ہی کے طبقہ کے فرد نے آپ کے دعویٰ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ کیا اب بھی آپ یہی کہیں گے کہ وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں آج کی قوموں کے برابر نہ لا سکے۔

پاکستانی قوم کو ہم نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ڈاکٹر ثمر مبارک دیئے ہیں۔ قوم میں تو ہر مذہب ومسلک کے افراد شامل ہوتے ہیں لہٰذا اگر اس فہرست میں ڈاکٹر عبدالسلام کو بھی شامل کرلیا جائے تو آسمان نہیں گر پڑے گا۔ عالمی سطح پر پاکستانی قوم نے دوسری قوموں سے بھی اپنا لوہا منوایا ہے کہ ہمارے سائنس دانوں کو خریدنے کی کوشش ہو رہی ہیں۔ جابر بن حیان، رازی، ابن سینا، ابن الہیثم، البیرونی، خوارزمی جیسے نامور مسلم سائنس دانوں سے غیر مسلم بھی واقف ہیں۔ یونیورسٹی آف دی آنا۔ یونیورسٹی آف دی سالولو۔ یونیورسٹی آف دی ماؤنٹ پلیئر فرانس میں رازی اور ابن سینا کی کتابیں میڈیسن کے نصاب میں شامل ہیں۔ آپ کے انتہا پسند اور فرقہ وارانہ مذہبی مدارس بے ریش مسلمانوں کو جہاد کے نام پر مروا کر مستقبل کے رازی۔

ابن سینا۔ابن الہیثم ۔جابر بن حیان ۔البیرونی اور خوارزمی کو قتل کرایا جارہا ہے۔ بتاؤ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

میرے محترم دوست آفتاب عروج آف چنیوٹ نے صحیح کہا کہ۔''زاہدالراشدی کا ۱۸۵۷ء سے دو طبقات کا مفروضہ تاریخ سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔مسلم امہ میں جتنے بھی سائنسدان ہوگزرے ہیں ان میں کوئی بھی مولوی نہ تھا اور نہ ہی ان میں کوئی انگریزی جانتا تھا لیکن انہوں نے تاحیات تحقیق وجستجو کے قرآنی حکم کو اپنا فریضہ زندگی سمجھ کر جاری رکھا۔مصر فتح ہوا تو ہمارے سائنسدان منجنیق اور نیپام میزائل تیار کر چکے تھے۔''

زاہدالراشدی اس غلط فہمی میں بھی مبتلا ہیں کہ جو مذہبی مدارس کا ۷ سالہ نصاب پڑھ کر سند فراغت حاصل کرے گا وہ عالم ہوگا جبکہ قرآن کہتا ہے۔''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی ہے (کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ) اللہ کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح ایسے عظیم کارگۂ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر آگے بڑھائے جارہا ہے۔'' (فاطر ۳۵۔۲۷۔۲۸)۔

اس سے ثابت ہوا رب العالمین اللہ جل جلالہ کے نزدیک ''علماء'' وہی ہیں جنہیں آج کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہتے ہیں۔یہی ہیں جو کائناتی نظام کا مطالعہ کرتے ہیں اور مسلسل مشاہدات وتجربات کے بعد فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے ہیں انہیں کائناتی مفکر بھی کہتے ہیں۔ خاکسار اعظم علامہ عنایت اللہ خان مشرقی متوفی ۱۹۶۳ء۔مفکر قوم سرسید احمد خان متوفی ۱۸۹۸ء۔ڈاکٹر عبدالقدیر خان ۔ڈاکٹر ثمر مبارک صحیح معنوں میں علماء، سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر ہیں۔

زاہدالراشدی یہ بھی کہتے ہیں کہ''۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے ہمارا پورا نظام تلپٹ کر دیا تھا۔دینی مدارس ختم کر دیئے تھے۔'' یہ ایک تاریخی جھوٹ ہے جس کی نشاندہی انصر رضا نے یوں کی ہے کہ''اس میں ایک غلط بیانی یہ کی گئی ہے کہ انگریزوں نے دینی مدارس ختم کر دیئے تھے۔ میں انگریزوں کا حامی نہیں ہوں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مدرسہ دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ انگریزوں کے دور میں ان کی سرپرستی میں ہے۔دارالعلوم ندوۃ (العلماء لکھنؤ) کا سنگ بنیاد یو۔پی کے لیفٹیننٹ گورنر نے رکھا تھا۔''

مجھے ایک طرف تو خوشی ہوئی کہ زاہدالراشدی نے اپنے جھوٹ کا اقرار ان الفاظ میں کر لیا کہ''انگریزوں کی طرف سے دینی مدارس کی سرپرستی کے حوالہ سے آپ کا موقف درست ہے۔'' لیکن دوسری طرف مجھے بے حد دکھ ہوا کہ پھر انہوں نے ایک اور تاریخی جھوٹ بولا کہ''جہاں تک دیوبند کے مدرسہ کی انگریزوں کی طرف سے سرپرستی کا سوال ہے ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں دیوبند کے مدرسے اور مکتب فکر کا تاریخی ''استعمار دشمن'' کردار اس کی وضاحت کے لئے کافی ہے اور کسی منصف مزاج شخص کے لئے اس سے زیادہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔''

زاہدالراشدی ترجمان اسلام۔خدام الدین سے

الشریعہ تک پہنچے ہیں اور اب اپنے ''اباجی'' جو ''محدث اعظم پاکستان'' کہلواتے ہیں کہ مسند شیخ پر فائز ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے علم میں نہیں ہوگا کہ یکم جنوری ۱۹۱۵ء کو گورنر یو۔پی سر جیمس مسٹن نے دارالعلوم دیوبند کا دورہ کیا اور اس نے دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم فخر الہند حبیب الرحمٰن عثمانی۔فقی دارالعلوم دیوبند مفتی اعظم ہند عزیز الرحمٰن عثمانی اور مدرس دارالعلوم دیوبند شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی کی موجودگی میں قاسم العلوم والخیرات محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادے حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند کو وائسرائے ہر ایکسی لینسی کی جانب سے ''شمس العلماء کا خطاب دیا۔زاہد الراشدی اس طرح نانوتوی اور عثمانی خاندانی دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے کی خلوت گاہ میں مصروف راز و نیاز رہے اور مسٹن کے ذریعے دنیا کے سب سے بڑے ''استعمار دشمن'' بلکہ قوم و ملت کے ''دشمن اعظم'' حکومت کے ساتھ روابط مزید استوار اور مستحکم کرتے رہے۔یقین نہ آئے تو اپنے شیخ العرب والعجم حسین احمد مدنی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند و امیر جمعیت العلمائے ہند کی نقش حیات جلد۲ صفحہ۲۴۴ اٹھا کر دیکھ لیں۔مزید تسلی کے لئے دی انڈین مسلمز اے ڈاکومنٹری ریکارڈ (۱۹۴۷ء تا ۱۹۰۰ء) انٹرلیسٹ ان ورلڈ وار جلد ۵ مرتبہ شان محمد دہلی ۱۹۸۲ء اٹھا کر دیکھ لیں۔دارالعلوم دیوبند کے مہتمم۔نائب مہتمم۔صدر مفتی اور مدرس کے انگریز کے وفادار ہونے کی تسلی چاہئے تو سازش کیس کی ڈائریکٹری اٹھا کر دیکھ لیں۔

زاہد الراشدی یہ بھی یاد رکھا کریں کہ ''شمس العلماء'' کے خطابات حافظ محمد احمد نانوتوی مہتمم دارالعلوم دیوبند۔محمد یوسف انجور عظیم آبادی مخلص وصادق اور وفادار ترین معتقد سید احمد بریلوی۔احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی فاضل دیوبند۔نذیر حسین دہلوی۔محمد حسین بٹالوی۔محمد حفیظ اللہ صدر مدرس دارالعلوم ندوۃ العلام ءلکھنؤ۔حاجی محمد عمر مرید خاص اشرف علی تھانوی وغیرہ کو بھی ملے تھے۔

محترم انصر رضا نے لکھا کہ ''کون نہیں جانتا؟ مشہور ترین مثال سرسید احمد خان کی ہے جنہوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سے روشناس کرانے کی ٹھانی اور بدترین ظلم کا نشانہ بنے۔'' اس کا جواب زاہد الراشدی نہ دے سکے اور ادھر آ نکلے کہ ''سرسید احمد خان مرحوم نے قرآن وسنت کی جس نئی تعبیر وتشریح کی داغ بیل ڈالی تھی اس کی صرف علماء نے مخالفت نہیں کی بلکہ انہیں خود سرسید مرحوم کے رفقاء مولانا الطاف حسین حالی مرحوم۔شبلی نعمانی مرحوم اور ان کے دیگر معاصرین مثلاً اکبر الہ آبادی مرحوم نے بھی قبول نہیں کیا تھا اور ان تعبیرات وتشریحات سے کھلے بندوں برأت کا اظہار ضروری سمجھا تھا۔اور اس سے بڑھ کر سرسید احمد خان مرحوم کے شاگردوں میں سے بھی کسی نے دین کی اس تعبیر وتشریح کو اختیار نہیں کیا تھا۔اگر سرسید احمد خان مرحوم کے کسی ساتھی یا شاگرد کا نام انصر رضا کو معلوم ہو کہ اس نے سرسید احمد خان کی دینی تعبیرات کو اختیار کیا تھا اور انہیں آگے بڑھانے میں دلچسپی لی تھی تو وہ اس کی نشاندہی فرما دیں۔میں اس پر ان کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔''

زاہد الراشدی سب سے پہلے اس غلط فہمی کو دل

سے نکال دیں کہ الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی نے بھی سرسید کی مخالفت کی تھی۔ بعض معاملات میں اختلا ف ہو جانے کا یہ مطلب آپ کو کس نے بتا دیا کہ اسے مخالفت کہا جاتا ہے! البتہ یہ حقیقت ہے کہ سرسید کی مخالفت مصنف ترجمان القرآن علامہ ابوالکلام احمد آزاد دہلوی۔ مصنف ردنیچریہ جمال الدین افغانی۔ مترجم الردعلی الدھریین فقی محمد عبدہ۔ مصنف تائید اسلام علی بخش سب آرڈی نیٹ جج گورکھ پور۔ امداد علی ڈپٹی کلکٹر کانپور۔ اکبر الہ آبادی۔ نواب صدیق حسین خان نے زور شور سے کی تھی۔

زاہدالراشدی کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ سرسید نے قرآن وسنت کی جس نئی تعبیر وتشریح کی داغ بیل ڈالی تھی ان کے رفقاء اور معاصرین نے نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ ان سے کھلے بندوں برأت کا اظہار بھی ضروری سمجھا۔ میں نے اگر اپنی طرف سے بات کی تو راشدی ہوسکتا ہے تسلیم نہ کرے اس لیے میں رئیس القلم آغا محمد اشرف متوفی کی طرف رجوع کرتا ہوں وہ کہتے ہیں ''سرسید نے جس دینی فکر کی بنیاد رکھی اس کی ترقی میں شبلی۔ چراغ علی۔ نذیر احمد اور محسن الملک نے برابر کا حصہ لیا۔ ان سب بزرگوں نے بڑی اہم تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ سب سرسید کے علم الکلام سے متاثر ہوئے۔ ان میں سرسید کے فکر سے قریب ترین چراغ علی تھے۔ وہ سرسید کے ان پرجوش حامیوں میں سے ہیں جو اختلافی مسائل میں اپنے پیشوا سے بھی زیادہ انتہا پسند ہو جایا کرتے ہیں۔'' (سرسید احمد خان صفحہ ۴۴۔۴۵)۔

زاہدالراشدی آپ کو میں نے آپ کے طبقہ سے دلیل دی دے اب بتائیں کیا کسی شاگرد نے اس تعبیر وتشریح کو اختیار نہیں کیا تھا۔ مزید تسلی کے لئے تلمیذ سرسید علی احمد دانشمند جالندھری کا آسان ترجمہ قرآن مجید اور قصص الانبیاء کا مطالعہ کریں۔ اب تو علامہ جیلانی قریشی نے سہ ماہی ''اعتزال'' کراچی بھی جاری کر دیا ہے جو سرسید کے نظریات کا نقیب ہے۔ آپ کے علم میں ہونا چاہئے کہ سلطان المورخین علامہ محمد اسلم جیراجپوری متوفی ۱۹۵۵ء مفکر قران علامہ غلام احمد پرویز متوفی ۱۹۸۵ء مصنف المنار علامہ رشید رضا مصری متوفی ۱۹۳۵ء قاموس یار جنگ علامہ عبداللہ عمادی متوفی ۱۹۴۷ء شمس العلماء حافظ محبّ الحق متوفی ۱۹۵۰ء ڈاکٹر عبدالودود متوفی ۲۰۰۱ء۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب متوفی ۲۰۰۳ء۔ علامہ محمد علی رسول نگری متوفی۔۔۔۔ علامہ عطاء اللہ پالوی متوفی ۱۹۹۸ء وغیرہم نے سرسید ہی کی تعبیر وتشریح کو اختیار کیا تھا۔ اور یہ سرسید کی فکر کی حقانیت کی دلیل تھی کہ بانی دارالعلوم دیوبند علامہ محمد قاسم نانوتوی متوفی ۱۸۷۹ء کے داماد علامہ عبداللہ انصاری علی گڑھ کالج کے شعبہ دینیات کے پہلے سربراہ بنے اور محمد انور کشمیری متوفی ۱۹۳۳ء کے شاگرد خاص رئیس القلم علامہ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی متوفی ۱۹۸۵ء علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے سربراہ بنے۔ اگر سرسید کی فکر درست نہ ہوتی تو انصاری اور اکبرآبادی کبھی بھی علی گڑھ نہ آتے۔

ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ جولائی ۲۰۰۳ء میں سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی نے مصنف ضیاء الدین لاہوری کا مضمون ''سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم میں سرسید کا

مہینہ حصہ۔ پڑھا تو سخت افسوس ہوا جس میں انہوں نے غلط طریقہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید کی تعلیمی جدوجہد کے پیچھے ان کا مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانا نہیں بلکہ مسلمانوں اور انگریزوں کے مابین دوستانہ راہ و رسم پیدا کرنا اور انگریز کے مخلص وفادار پیدا کرنا تھا۔

مفکر قوم سرسید احمد خان نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۱۰ء میں ایک اہم لیکچر انگلش میں دیا جس کا اردو ترجمہ ''ملت بیفا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے اسی زمانے میں ہوا تھا اس میں ہو کہتے ہیں۔

''ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسی علماء اور واعظ سرانجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی سرانجام دہی کے پوری طرح اہل نہیں ہیں۔ پس یہ امر قطعی طور پر نہایت ضروری ہے ایک نیا مثالی دارالعلوم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دلکش انداز سے ہوئی ہو۔''

آغا محمد اشرف لکھتے ہیں۔''دن رات کامل غور و فکر کے بعد انہوں نے یہ معلوم کیا کہ مسلمان زمانے کے تقاضے کو نہیں سمجھتے اور جدید حالات سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ ان تمام خامیوں اور محرومیوں کا علاج تعلیم ہے اور تعلیم بھی جدید تعلیم۔'' (سرسید احمد خان صفحہ ۱۰)۔

آغا محمد اشرف مزید لکھتے ہیں۔''دوسرا کارنامہ ان کا علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام تھا اس کالج نے قوم میں نئی روشنی اور نئی بیداری پھیلا دی۔ نوجوانوں کی ذہنیت کو بدل دیا۔ رفتہ رفتہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی روشن خیال۔ تعلیم و تہذیب اور علم و ادب کا مرکز بن گئی۔'' (سرسید احمد خان صفحہ ۱۲)۔

زاہدالراشدی علی گڑھ تحریک کے ان اہم امکانوں پر نظر ڈالیں تو انہیں معلوم ہوگا سرسید اکیلا نہیں تھا بلکہ علامہ سمیع اللہ خان۔ محسن الملک نواب مہدی علی خان۔ وقار الملک نواب مشتاق حسین۔ شمس علماء خواجہ الطاف حسین حالی۔ شمس العلام ء علامہ شبلی نعمانی۔ شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد۔ علامہ چراغ علی۔ علامہ ذکاء اللہ۔ نواب عماد الملک۔ علامہ عبدالحلیم شرر۔ نواب صدر یار جنگ۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق۔ علامہ طفیل احمد۔ بابائے صحافت علامہ ظفر علی خان۔ سجاد حیدر۔ عزیز مرزا۔ علامہ عنایت اللہ۔ علامہ حسرت موہانی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ علامہ عبدالماجد دریابادی۔ خواجہ غلام السیدین۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ قاضی تلمذ حسین۔ پروفیسر محمد الیاس برنی۔ سر راس مسعود مصنف۔ سپرٹ آف اسلام جسٹس امیر علی۔ نواب اسحاق خان ان کے ساتھ تھے۔

زاہدالراشدی ذرا غور تو کریں آپ کے ہی طبقے کے ڈاکٹر عبدالخالق کس طرح آپ کا رد کئے جا رہے ہیں۔ ''بعض خود ساختہ شرائط کے ساتھ اجتہاد کا دروازہ ہم نے بند کر رکھا ہے۔ طبقہ علماء میں کوئی ایسی قیادت ابھر کر آئی ہے

جس نے واقعتاً مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا ہو؟ پوری امت مسلمہ ایک امام سے محروم ہے۔ دین کے غلط تصورات کو بنیاد بنا کر تخریب کاری اور دہشت گردی کی ترویج کا باعث بھی یہی طبقہ بنا ہے۔'' اور تھک ہار کر تو زاہدالراشدی بھی اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ''ایک اصولی بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جس کا حوالہ محترم ڈاکٹر عبدالخالق اور محترم آفتاب عروج دونوں نے دیا ہے کہ غلطیاں ہر طرف سے ہوئی ہیں اور کوئی بھی ان سے مبر انہیں ہے۔ یہ بات سو فیصد درست ہے۔''

زاہدالراشدی آپ خود کہتے ہیں۔ ''ہمیں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف میں کبھی حجاب نہیں رہا۔'' تو پھر اپنی اس بات کی تردید کر دیں کہ اشرف علی تھانوی۔ غلام محمد گھوٹوی۔ مہر علی گولڑوی۔ محمد انور کشمیری۔ حسین احمد مدنی۔ کفایت اللہ دہلوی۔ ثناء اللہ امرتسری۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔ امین احسن اصلاحی ماہرین ہیں کیونکہ یہ تمام روایتی ملاں ہیں۔

محترم احمد اشرف آف کراچی نے بھی درست کہا۔ ''دوسرے طبقے نے اپنی ذمہ داری یوں پوری کی کہ وہ ہندوؤں سے کسی طور پر پیچھے نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ایٹم بم کے معاملہ میں ایکطرح سے ہندو سے بڑھ گیا اور پھر ہندوؤں کا ایٹم بم ایک مسلمان (صدر انڈیا ڈاکٹر) عبدالکلام کا ممنون ہے۔ (پہلے طبقے) ناکامیاب اس طرح ہوئے کہ اول تو امت کو متحد نہ رکھ سکے۔ یہ فرقے در فرقے میں تحلیل ہوتی رہی۔ دوم ایسے ایسے عقیدے فراہم ہوئے کہ دین خالص کا حلیہ ہی بگڑ گیا۔ ایک نیا اسلام ظہور میں ہے اور ہمارے علماء اس پر خاموش ہیں کیونکہ اس گمراہی سے نپٹنا آسان نہیں ہے۔''

مذہبی پیشوائیت ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں دے سکی کہ پاکستان میں پبلک لا زکس طرح مدون کئے جائیں جو سنی اور شیعہ دونوں کے نزدیک اسلامی ہوں؟ اور اگر ایسے قوانین کا مرتب ہونا ممکن نہیں تو پھر کہاں کس قسم کے قوانین نافذ کئے جائیں؟

ہم نے اپنا کام کر دکھایا پاکستان کو ایٹمی طاقت ہے۔ آپ نے اپنا کام کیوں نہیں کیا کہ پاکستان میں اسلامی نظام نہیں ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید امتیاز احمد

قرآن اور سائنس

معروفِ عالم فرانسیسی مستشرق موریس بوکائیے کی ایک کتاب "Origin of man" In the light of Holy scriptures" کا اردو ترجمہ سید امتیاز احمد صاحب نے ''بائبل، قرآن اور انسان: جدید سائنس کی روشنی میں'' کے عنوان سے کیا ہے۔ درجِ ذیل تحریر ان کی اسی کتاب کے دیباچے کا ایک اقتباس ہے۔ امید ہے قارئینِ طلوع اسلام اسے مفید پائیں گے۔ (مدیر)

8 فروری 1600ء کا دن تھا جب اطالوی فلسفی، ماہر فلکیات اور ریاضی دان برونو کو ایک کلیسائی احتسابی عدالت نے سزائے موت سنا دی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد گیلیلیو بھی دس پادریوں پر مشتمل ایک ایسی ہی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ یہ واقعہ 12 اپریل 1633ء کا ہے۔ گیلیلیو کی عمر اس وقت ستر برس کے قریب ہو چکی تھی، سو اس کے بڑھاپے پر رحم کھایا گیا اور اسے سزائے موت نہ دی گئی تاہم اسے اپنے ''لغو'' نظریات کو سرِ عام غلط قرار دے کر ان سے توبہ کرنی پڑی۔ وائی کلف بیچارہ سب سے بُرا رہا۔ اس نے کسی وقت زمین کو چند کروڑ برس پرانا قرار دے دیا تھا۔ اس کی موت کے بعد ایک پادری صاحب نے بائبل میں دی گئی معلومات کی مدد سے حساب لگایا تو یہ عرصہ چند ہزار برس نکلا۔ وائی کلف کو اپنے کہے کی سزا بعد از مرگ بھگتنی پڑی۔ اس کی ہڈیاں ریزہ ریزہ کر کے سمندر برد کر دی گئیں۔ لیکن یہ صورتحال مسلسل برقرار نہیں رہ سکتی تھی، ردعمل بھی لازم تھا چنانچہ جب 1859ء میں ڈارون کی Origin of Species سامنے آئی تو جملہ کارپردازان مذہب سوائے تیوریاں چڑھانے اور فتاویٰ تکفیر جاری کرنے کے کچھ نہ کر سکے کیونکہ اب عوامی حمایت سائنس کے ساتھ تھی۔ چارلس ڈارون کے نظریات کو عالمگیر قبولیت عامہ حاصل ہوئی لیکن اس قبولیت کا سبب ان نظریات کے حق میں موجود دلائل کی مضبوطی نہیں تھی بلکہ وہ نفرت تھی جو کلیسا کے خلاف دلوں میں جمع ہوتی رہی۔ کسی زمانے میں اگر سائنسی حقائق کو مذہبی عقائد کی مدد سے پرکھا گیا تھا تو اب مذہبی عقائد کو سائنسی نظریات کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ کچھ لوگوں نے تو مذہب کو مستقلاً خدا حافظ کہا اور بیشتر اگرچہ مذہب سے دستبردار تو نہیں ہوئے لیکن ''ذاتی معاملہ'' قرار دے کر مذہب کو پس منظر میں ضرور بھیج دیا۔

گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب اور سائنس کی جنگ میں سائنس فتحیاب ہوگئی۔ لیکن کیا یہ جنگ واقعی مذہب اور سائنس کے مابین تھی؟ گو بظاہر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے مگر درحقیقت یہ مناقشت سائنس اور رومن کیتھولک کلیسا کے درمیان تھی۔ رومن کیتھولک مسیحی علماء بائبل کو منزّل من اللہ اور خطا سے محفوظ باور کرتے اور کرواتے تھے۔ مجموعی طور پر ان کے نزدیک بائبل کے کسی جزو کا ردعمل مسیحیت کے مکمل انکار پر منتج ہو سکتا تھا لہٰذا انہوں نے بائبل کے کسی جزو کا انکار کرنے والوں سے وہی سلوک کیا جو ان کے نزدیک کامل ارتداد کی صورت میں روا تھا.....۔۔۔۔

یہ تمام بحث اپنی جگہ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس صورتحال کو تمام مذاہب اور ہمارے نقطۂ نظر سے اسلام پر منطبق کرنا درست ہوگا؟

تمام مذاہب کے حوالے سے بات کی جائے تو گفتگو بہت طویل ہو جائے گی اور اگر اسلام کی بات کریں تو شاید درج ذیل قول مکمل صورتحال کی اجمالاً وضاحت کے لئے کافی ہو سکتا ہے:

نظام کائنات اللہ تبارک وتعالیٰ کا فعل ہے۔قرآن اللہ تعالیٰ وتبارک کا قول ہے اور اللہ کے قول وفعل میں تضاد ممکن نہیں۔

مسلمانوں کا رویہ مجموعی طور پر انتہائی مثبت رہا ہے۔ انہوں نے اپنے دورِعروج کے دوران جملہ علوم وفنون میں انتہائی ترقی کی لیکن انفس وآفاق سے متعلق ان کے علم میں ہونے والا اضافہ خالق کائنات پر ان کے ایمان کو متزلزل کرنے کا سبب نہیں بنا۔

البتہ ہم یہاں اتنا ضرور کہنا چاہیں گے کہ آج مغربی دنیا میں مذہب اور سائنس کے درمیان جاری کشاکش اور اس کے نتائج و عواقب میں مسلمان علماء کے لئے کچھ نہ کچھ سبق ضرور موجود ہے۔ دین اسلام اور قرآن مجید یقیناً سائنسی علوم کے مخالف نہیں لیکن مسلمان علماء تقلیدِ جامد کا شکار ہو کر وقتاً فوقتاً ایسے رویوں کا اظہار ضرور کرتے رہے ہیں جن کی مماثلت ازمنۂ وسطیٰ کے **کلیسائی رویوں** کے ساتھ نظر آتی ہے۔

ہمیں قرآن مجید جیسی نعمت عطا کی گئی ہے جس کی روشنی ہر دور میں الحاد وگمراہی کے اندھیروں سے بچا سکتی ہے۔ سائنسی تحقیقات وانکشافات قرآن کی تائید وتوثیق کرتے ہیں اور قرآن سائنسی علوم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ہمیں اس نعمت عظمیٰ کی قدر کرنی چاہئے اور قرآن کی قدر کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم پر قرآن کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کیا جائے یعنی قرآن کو پڑھا جائے۔ سمجھا جائے۔ اس میں تدبر وتفکر کیا جائے۔اس کے احکامات پر عمل کیا جائے اور اس کا پیغام پورے عالم انسانیت تک پہنچایا جائے۔ حدیث' فقہ' تصوف' کلام سب قرآن کے خادم ہیں انہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن کے مساوی قرار دے کر ہم بھی اسی صورتحال کا شکار ہو سکتے ہیں جس کا سامنا آج کیتھولک کلیسا کو ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ اقبالؒ

جناب رسالتمآب ﷺ کا ادبی تبصرہ

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا ان کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لئے خطِ پاشاں کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپ نے ارشاد فرمائیں ان سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانہ میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے' اس لئے کہ ان کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے اور آج کل انہیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے۔ شاعری کیسی ہونی چاہئے اور کیسی نہ ہونی چاہئے۔ یہ وہ عقدہ ہے جسے جناب رسالت مآب ﷺ کے وجدان نے اس طرح حل کیا ہے۔ امراء القیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جناب پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی۔ اشعرا لشعراء وقائدھم الی النار یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کونسی باتیں ہیں جنہوں نے حضور سرور کائنات صلعم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شرابِ ارغوانی کے دورِ عشق و حسن کی ہوشربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں' آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں' سنسان ریتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دورِ جاہلیت کی کل تخیلی کائنات ہے۔ امراء القیس قوت ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنون لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن' یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھا دے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کے مشکلات و امتحانات میں دل فریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے وہ فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے' نہ یہ کہ اٹھائی گیرہ بن کر جو

رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے‘اس کو بھی ہتھیا لے۔

ایک دفعہ قبیلہ بنوعیس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا:

ولقد ابیت علی الطویٰ واظلہ‘
حتی انال بہ کریم الماکل

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تا کہ میں اکلِ حلال کے قابل ہوسکوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصد وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آئند اور مطبوع کر کے دکھائیں‘اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ’’کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔‘‘

اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزندِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دنیوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا خود ایک بت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں اس کی گوں کی بات کہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی‘بولتی چالتی تصویر ہے۔حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں‘جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔حضور خواجۂ دو جہاں صلعم (بابی انت وامی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

ہر وہ استعداد جو مبدء فیاض نے فطرت انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے‘ایک مقصدِ وحید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے‘قوت سے لبریز ہو‘جوش سے سرشار ہو‘ہر انسانی صنعت اس غایتِ آخرین کی تابع اور مطیع ہونی چاہئے اور ہر شئے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گردوپیش موجود ہیں (کہ انہیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں‘انحطاط اور موت کا پیغام ہیں۔صنعت گر کو چنیا بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہئے۔مصورِ فطرت کو اپنی رنگا رنگ نگارآرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لئے افیون کی چسکی سے احتراز واجب ہے۔یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمالِ صنعت اپنی غایت آپ ہے‘انفرادی‘اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے۔غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اس نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح شانِ ارتقاء کیا ہونی چاہئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سنت رسول اللہ ﷺ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بھیجا تو اسے جسمانی قوتیں عطا کیں اور ان کے ساتھ ہی عقل وشعور کا مادہ بھی۔ لیکن جس طرح اس کی جسمانی قوتیں محدود ہیں اسی طرح اس کی عقل وفکر کی بھی ایک حد ہے۔ اس کی جسمانی قوتوں کی محدودیت کی کمی پوری کرنے کے لئے اس کی عقل نے آلات ایجاد کئے۔ (جس چیز تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچتا یہ اس تک سیڑھی کے ذریعہ پہنچ جاتا ہے) لیکن اس کی عقل کی محدودیت کی کمی یہ خود پوری نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کیا کہ اسے اپنی طرف سے راہنمائی دی جائے۔ اس راہنمائی کی شرح یہ نہیں تھی کہ ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی جائے کہ زندگی کا فلاں راستہ صحیح ہے اور فلاں غلط۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب کر لیتا اور اسے وحی کے ذریعے بتا دیتا کہ نوع انسانی کے لئے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اس وحی میں نہ تو اس منتخب فرد کی اپنی عقل وبصیرت کا کوئی دخل ہوتا اور نہ ہی اس کے کسب و ہنر کا کوئی واسطہ۔ اسے وحی براہ راست خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی۔ خدا کی طرف سے اس طرح وحی ملنے کے منصب کو منصب نبوت کہا جاتا ہے اور حامل وحی کو نبی۔

وحی کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کو بتایا جائے کہ انہوں نے اس دنیا میں کس طرح رہنا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہونا چاہئے۔ اس کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے معاملات کا تصفیہ کیسے ہونا چاہئے۔ مختصر الفاظ میں وحی کا مقصود یہ بتانا تھا کہ انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا نقشہ کس قسم کا ہونا چاہئے ظاہر ہے کہ یہ مقصد حاصل ہو نہیں سکتا جب تک اس نقشہ کی عملی شکل قائم کر کے نہ دکھا دی جائے اور انسانوں کو اس پر چلا کر یہ بتا نہ دیا جائے کہ وحی جس زندگی کا مطالبہ کرتی ہے وہ ناممکن العمل نہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر نبی کے ذمہ یہ فریضہ بھی تھا کہ وہ وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے اور عملاً بتائے کہ اس کے مطابق زندگی کا نقشہ کیسے مرتب ہوگا۔ نبی کے اس منصب کو منصب رسالت کہا جائے گا۔ واضح رہے کہ ہم نے نبوت اور رسالت کے مناصب کا یہ فرق اس منتخب فرد کی دو حیثیتوں کو سمجھانے کے لئے بیان کیا ہے۔ ورنہ نبی رسول ہوتا ہے' اور رسول' نبی ہوتا ہے۔ قرآن میں ایک ہی فرد کے لئے کہیں نبی اور کہیں رسول کا لفظ آیا ہے۔ لیکن مقصد پیش نظر کے اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس فرق کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یعنی خدا سے وحی ملنے کا منصب' منصب نبوت ہے اور اس وحی کو دوسروں تک

پہنچانا اور اس کے مطابق عملی نظام قائم کرنا' منصب رسالت۔ مقصد اس تمام پروگرام کا یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کو خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق چلایا جائے۔ اس کو خدا کی اطاعت کہتے ہیں۔

اب آگے بڑھئے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب مختلف انسانوں نے مل کر ایک نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنی ہو تو اس نظام کا کوئی مرکز بھی ہونا چاہئے۔ جب رسول' وحی کے نقشے کے مطابق نظام قائم کرتا تو اس نظام کا مرکز خود اس رسول کے سوا کوئی ..... اور ہو نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا ان تمام افراد کے لئے جو وحی کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کر کے اس نظام کے اجزاء بنتے تھے' اس رسول کی اطاعت ضروری ہوتی تھی۔ یہ اطاعت درحقیقت خدا ہی کی اطاعت ہوتی تھی کیونکہ رسول' اپنی ذات کی اطاعت نہیں کراتا تھا بلکہ خدا کے قوانین ہی کی اطاعت کراتا تھا۔ لہٰذا' وحی کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں رسول کی اطاعت کے بغیر' خدا کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

خدا کی طرف سے یہ سلسلۂ نبوت و رسالت چلا آ رہا تھا تا آنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں سرزمینِ حجاز میں نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے۔ ان پر جو وحی نازل ہوئی وہ ایسی مکمل تھی کہ اس کے بعد نوع انسانی کے لئے مزید وحی کی ضرورت نہ رہی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی ذات پر نبوت کا خاتمہ کر دیا اور آپ پر نازل کردہ وحی کو قرآن کی شکل میں منضبط کر کے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ اس سے نبی اکرم ﷺ کے منصب نبوت کی بھی تکمیل ہو گئی اور نفس نبوت کا اختتام بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم النبیین قرار دیا ہے۔

اب رہا فریضۂ رسالت' سو اس کے لئے حضور ﷺ نے وحی کے ذریعہ بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق ایک نظام متشکل کیا اس نظام کی بنیاد اس نظام کے مرکز یعنی خود رسول اللہ کی اطاعت پر تھی۔ رسول اللہ اس نظام کو واضح اور نکھری ہوئی صورت میں امت کو دے کر اس دنیا سے تشریف لے گئے اور دنیا کو بتا گئے کہ قانون خداوندی کے مطابق انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نقشہ کس قسم کا ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات سے نبوت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن وحی کے مطابق نظام کو تو بہرحال آگے چلنا تھا' اس نظام کو جماعت مومنین نے قائم رکھا اور رسولؐ اللہ کی بجائے' خلفیۃ الرسول' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس نظام کا مرکز منتخب کیا۔ اب افراد امت کے لئے اس مرکز کی اطاعت بمنزلہ خدا اور رسول کی اطاعت کے تھی اور خلیفۃ الرسول کے سامنے خدا کا قانون (قرآن کی شکل میں محفوظ تھا) اور اس کے علاوہ وہ منہاج و مسلک جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اس نظام کو متشکل فرمایا اور آگے چلایا تھا۔ رسول اللہ کے اس عملی طریقہ کا نام ''سنت رسول اللہ'' تھا۔ سنت کے معنی ہی طریقہ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی تئیس (۲۳) سالہ رسالت کی زندگی میں اس نظام کو بتدریج متشکل فرمایا تھا۔ اس لمبے عرصہ میں حالات میں کافی تغیر و تبدل ہوا۔ جس دن حضور ﷺ نے اس دعوت کے لئے پہلی آواز بلند فرمائی اور

جس روز آپ دنیا سے تشریف لے گئے' اس کے درمیانی عرصہ میں یہ کاروانِ رشد وسعادت' مختلف منازل میں سے گزرا حضورﷺ ایک راہ شناس اور واقفِ منزل میرِ کارواں کی طرح ان تمام منازل ومراحل میں' اپنی خداداد بصیرت اور رفقائے کار' (صحابہؓ) کے مشورہ سے' حالات کے تقاضے کے مطابق عملی نقشے بناتے اور وقت اور موقعہ کے مناسب ہدایات نافذ فرماتے' مقدسین کے اس قافلہ کو آگے بڑھاتے گئے۔ مثلاً نماز جیسے اہم فریضہ میں بھی پہلے ہر نماز میں دو رکعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ بعد میں ان میں اضافہ ہوا۔ (مشکوٰۃ۔ بحوالہ مسلم و بخاری)۔ یا مکہ میں نماز کے لئے اذان کا قاعدہ نہیں تھا۔ اس کی ابتداء مدینہ میں جا کر صحابہ رضی اللہ عنھم کے مشورہ سے ہوئی۔ (بخاری) ظاہر ہے کہ اگر حضورﷺ اس کے بعد کچھ عرصہ اور بھی اس دنیا میں تشریف رکھتے تو آنے والے حالات کے مطابق کہیں پہلے نقشوں میں ردوبدل فرماتے اور کہیں جدید نقشوں کا اضافہ فرماتے۔ لیکن حضورﷺ کے بعد وہ سلسلۂ ردوبدل منقطع نہیں ہوا بلکہ آپﷺ کے خلفائے راشدینؓ اسے انہی خطوط پر آگے بڑھاتے گئے۔ یعنی اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق' اس مناسب ردوبدل کو نہ خلفائے راشدینؓ نے خلافِ سنت رسول اللہﷺ سمجھا نہ صحابۂ کبارؓ نے اسے ایسا قرار دیا۔ (مثال کے طور پر) جب حضرت عمرؓ نے' پورے غور وخوض کے بعد' یہ فیصلہ کیا کہ شام اور فلسطین کی مفتوحہ اراضی' فوج میں تقسیم نہیں کی جائے گی بلکہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رہے گی تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ فیصلہ خلافِ سنت رسول اللہ ہے۔ یا جب آپ نے وظائف کو علیٰ قدرِ مراتب بڑھایا گھٹایا تو کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ جب رسول اللہ نے ان میں مساوات کو قائم رکھا تھا تو آپ ان میں ردوبدل کیسے کر سکتے ہیں۔ (ہم نے صرف ایک آدھ مثال پر اکتفا کیا ہے ورنہ اس قسم کے متعدد واقعات ہیں جن میں عہد نبوی کے فیصلوں میں بعد میں عندالضرورت ردوبدل کیا گیا۔ اس قسم کی ایک تبدیلی (تطلیق ثلاثہ) کے ضمن میں امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ عہد حضرت عمرؓ کی سیاست کا یہی تقاضا تھا کہ ایسا ہی کیا جاتا۔) اس لئے کہ وہ حضرات اس حقیقت سے واقف تھے کہ حالات کے مطابق اس قسم کا ردوبدل خود سنت رسول اللہ کی اتباع ہے' اس لئے کہ حضورؐ خود حالات کے مطابق نظام کے نقشے میں ردوبدل فرماتے تھے۔ البتہ جن امور میں حالات کے تقاضے کسی تبدیلی کے داعی نہیں ہوتے تھے' وہ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیتے تھے۔ ان میں انہی نقشوں کے مطابق چلتے رہنا' اتباعِ سنت تھا۔ یعنی' اس نظام کے مرکز کے لئے' وحی کی روشنی میں اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق نظام خداوندی قائم رکھنا' اتباعِ سنت تھا اور افرادِ امت کے لئے اس مرکزِ نظام کے فیصلوں کی اطاعت کرنا' اطاعتِ خدا اور رسول کے مرادف۔ یاد رہے کہ خلفائے راشدین کی عمل میں لائی ہوئی تبدیلیاں بھی سنت کے مفہوم میں داخل ہیں چنانچہ جمعہ کی پہلی اذان جو حضرت عثمانؓ نے شروع فرمائی تھی اور نماز تراویح کی جماعت جو حضرت عمرؓ نے شروع کی تھی سنت تسلیم کی جاتی ہیں۔

اگر یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہتا تو اطاعتِ خداوندی اور اتباع سنت کا یہ عملی نقشہ آگے بڑھتا رہتا۔ لیکن

ہماری بدقسمتی سے یہ سلسلہ تھوڑے عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا۔ اب آپ اس مقام پر آجائیے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں اس وقت ہماری صورت یہ ہے کہ

(۱) وہ اسلامی نظام موجود نہیں جسے رسول اللہ ﷺ نے متشکل فرمایا تھا اور صحابہؓ نے آگے بڑھایا تھا۔ ہم اس وقت بالکل انفرادی زندگی بسر کررہے ہیں جو وحی کی منشاء اور سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہے۔

(۲) ہمارے پاس قرآن ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ وحی عطا کیا تھا۔

(۳) ہمارے پاس سنت رسول اللہ ﷺ یا آثار صحابہؓ کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جسے خود رسول اللہؐ یا خلفائے راشدینؓ نے مرتب کرایا ہو۔

(۴) ہمارے پاس روایات کا ایک ذخیرہ ہے جو نبی اکرم ﷺ اور عہد صحابہؓ کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے۔ (چنانچہ ان میں سب سے اہم کتاب' صحیح بخاری جو تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئی تھی کا نام خود امام بخاری نے ''الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ وایامہ'' رکھا تھا) لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ان مجموعوں میں صحیح روایات بھی ہیں اور غلط بھی۔ اصل بھی ہیں اور وضعی بھی۔ باہم متناقض ومخالف روایات بھی موجود ہیں جو ہوسکتا ہے کہ مختلف ادوار سے متعلق ہوں جنہیں آج ہم متعین نہیں کر سکتے۔ ایسی روایات بھی ہیں جو اپنے سیاق و سباق سے کٹی ہوئی ہیں یا جن میں ادھوری بات بیان ہوگئی ہے اور اس طرح بات کچھ سے کچھ بن گئی۔ حتیٰ کہ ایسی بھی ہیں جنہیں ہم کسی طرح بھی حضورؐ رسالت مآب کی ذات اقدس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ ایسی ہی روایتیں ہیں جن کے متعلق (اور تو اور) مولانا ابوالکلام آزاد جیسا اہل حدیث بھی اس کا اعتراف کرتا ہے' (اور ان کا یہ اعتراف صحیح بخاری کی ایک روایت پر تنقید کے سلسلے میں ہے) کہ ''روایات کی قسموں میں کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو' بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہوسکتا۔ **یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہوجائے گی۔''**

(ترجمان القرآن جلد دوم ص ۵۰۰)۔

روایات کے ان مجموعوں کے متعلق جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی رقمطراز ہیں کہ:

> ''یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبویؐ اور آثار صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں ہے کہ اس پر بالکل اعتماد کرلیا جائے۔''

سوال یہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ یہ کس طرح متعین کیا جائے

کہ صحیح سنتِ رسول اللہ اور آثارِ صحابہ کیا ہیں؟ اس لئے کہ جب تک یہ متعین نہ ہو جائے کون کہہ سکتا ہے کہ سنتِ رسول اللہ کی صحیح ترین شکل یہ ہے۔ اس تعین کی صورت یہ ہے کہ:

(۱) سنتِ رسول اللہ ﷺ کا ایک بڑا حصہ خود قرآن کے اندر ہے۔ جو یقینی طور پر صحیح ہے۔

(۲) روایات کا جو ذخیرہ ہمارے پاس ہے اسے پرکھنے کا معیار بھی خود قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ قرآن ہی پر عمل کیا کرتے تھے اور انہوں نے اس کے مطابق عملی نظام متشکل فرمایا تھا۔

(۳) اس ذخیرہ کو پرکھنے کا کام زید۔ بکر۔ عمر کے ذاتی طور پر کرنے کا نہیں۔ اس لئے کہ کسی فرد کو یہ حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے افراد امت سے کہے کہ جس بات کو میں سنت رسول اللہ کہتا ہوں اس کی اتباع تم پر فرض ہے اگر تم اس کی اتباع نہ کرو گے تو تمہیں منکرِ رسالت قرار دے دیا جائے گا۔

(۴) اس تعین کے لئے ضروری ہے کہ امت قرآن کی روشنی میں پھر سے وہی نظام قائم کرے جسے رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا اور صحابہؓ نے آگے بڑھایا تھا۔ اس نظام کا یہ کام ہو کہ وہ کتبِ روایات کے اس تمام ذخیرے کو قرآن کی روشنی میں پرکھے اور پھر (ہمارے لئے) متعین کر دے کہ اس کی رو سے سنت رسول اللہ ﷺ کی سب سے زیادہ صحیح شکل یہ ہو سکتی ہے۔ وہ قرآن کے قوانین اور اس طرح متعین کردہ سنت رسول اللہ کی روشنی میں امت کو چلائے اور جہاں جہاں ضرورت ہو' اس زمانے کے حالات کے مطابق' اس سنت رسول اللہ میں ضروری تبدیلی کرتا جائے جس طرح خلفائے راشدینؓ نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اس میں تبدیلیاں کی تھیں۔

(۵) جب تک ایسا نظام قائم نہ ہو اس وقت تک جس طرح امت انفرادی طور پر سنت رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتی آ رہی ہے اسی طرح کیا جائے (تاکہ امت انتشار سے بچی رہے) اس میں صرف اتنا دیکھ لینا ضروری ہو گا کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے جو صریحاً قرآن کے خلاف ہو۔ اس لئے کہ جو کچھ قرآن کے خلاف ہو گا وہ خود سنت رسول اللہ' کے بھی تو خلاف ہو گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ قرآن ہی کی اطاعت کیا کرتے تھے۔

یہ ہے ہمارے نزدیک اتباعِ سنت کی صحیح پوزیشن جس کی طرف ہم شروع سے دعوت دیتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم ملک کے اربابِ فکر و نظر سے باادب درخواست کریں گے کہ وہ ان معروضات پر دل کے سکون اور فکر کی گہرائی سے غور کریں اور پھر سوچیں کہ جس نتیجے پر ہم پہنچے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ارباب فکر و نظر سے یہ درخواست کرنا کہ وہ اس پر سکوت و سکون سے غور فرمائیں' عام حالات میں خود فکر اور نظر کی توہین ہے۔ لیکن اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ کسی معاملہ پر (بالخصوص جو مذہب سے متعلق ہو) خالی الذہن ہو کر' سکوت و سکون سے غور کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے اور اتباع سنت کا سوال اتنا اہم ہے کہ اس کا صحیح حل کئے بغیر ملت کی حیاتِ اجتماعیہ کا کوئی نقشہ صحیح نہیں

بیٹھے گا۔

جو حضرات یا جماعتیں، طلوع اسلام کو منکر حدیث پکار کر ایک بہت بڑے فتنے کا موجب قرار دیتی چلی آ رہی ہیں، ان سے بھی ہماری باادب درخواست ہے کہ وہ ازراہِ کرم صرف اتنا بتائیں کہ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس میں کوئی غلطی ہے۔ اور اگر غلطی ہے تو کہاں۔ اس کے لئے کسی لمبے چوڑے مضمون لکھنے کی ضرورت نہیں۔ فقط اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ فلاں مقام غلط ہے اور اس کی جگہ صحیح پوزیشن یہ ہے۔ اگر اس طرح ہماری کسی واقعی غلطی کی اصلاح ہو جائے تو ہم بدل شکر گزار ہوں گے اور اگر اس طرح کے غور و فکر کے بعد یہ متعین ہو جائے کہ سنت رسول اللہ کسے کہتے ہیں، وہ کہاں سے اور کس طرح حاصل ہو گی اور اس پر عمل کیسے ہو گا۔ تو اس سے ایک بہت بڑے سوال کا حل مل جائے گا جس کے متعین نہ ہونے سے اس وقت قوم عجیب الجھن میں ہے اور جس کی وجہ سے اس کی بہت سی توانائیاں بے نتیجہ ضائع ہو رہی ہیں بلکہ مضر نتائج پیدا کر رہی ہیں۔

کیا ارباب فکر و نظر اس طرف توجہ فرمائیں گے؟

(مختلف جرائد اور رسائل سے بھی گزارش ہے کہ وہ اس مقالہ کو اپنے ہاں شائع فرما کر اس اہم مسئلہ کے حل میں ہم سے تعاون کریں جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابن آدم

دَابۃُ الارض

دابۃ الارض کی تفسیر صدیوں سے ایک چیستاں بنی ہوئی ہے۔جس آیت میں اس کا ذکر ہے۔وہ یوں ہے۔

واذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دابۃ من الارض تکلمھم ان الناس کانوا بایٰتنا لا یوقنون۔(سورہ نمل ۸۲)۔

جب ان پر بات پوری ہو جائے گی۔تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک ''دابہ'' نکالیں گے۔جو انہیں بتائے گا کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہ لاتے تھے۔

ہماری تفسیر میں آپ کو کوئی لطف نہ آئے گا۔جب تک ''موضح القرآن'' اور ''تفسیر احمدی'' کی دو دلچسپ تفسیریں بھی نہ سن لیں۔موضح القرآن میں ہے کہ قیامت سے پہلے مکے کا پہاڑ صفا پھٹ کر اس میں سے ایک جانور نکلے گا اور لوگوں سے کہے گا کہ اب قیامت بہت نزدیک ہے پھر سچے مسلمانوں اور کافروں کے نشان لگا کر انہیں جُدے جُدے کر دے گا۔

یہ تو تھی مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی تصریح۔ اب اس تصریح کی مزید تشریح تفسیر احمدی کے مولف ملا جیون کی زبان سے سنئے۔ہم آپ کی دلچسپی کے لئے اسے نمبروار لکھتے ہیں۔

(۱) وہ جانور (یعنی دابۃ الارض) ساٹھ گز کا ہوگا۔

(۲) وہ اس قدر بھاگے گا کہ کوئی اس سے آگے نہیں نکل سکے گا۔

(۳) اس کے چار پاؤں اور پر اور روئیں ہوں گے اور دو بازو۔

(۴) منہ آدمی کا سا ہوگا۔

(۵) آنکھیں سؤر کی سی۔

(۶) کان ہاتھی کے (ناک کا نقشہ غالباً راوی کو یاد نہ رہا ہوگا)۔

(۷) سینگ پاڑے کے سے۔

(۸) گردن شتر مرغ کی سی۔

(۹) سینہ شیر کا سا۔

(۱۰) رنگ چیتے کا سا۔

(۱۱) کوکھیں بلی کی سی۔

(۱۲) دم بھیڑ کی سی۔

(۱۳) پتھر سے اس طرح نکلے گا جس طرح صالح علیہ السلام کی اونٹنی نکلی تھی۔اس میں اختلاف ہے کہ وہ رفتہ رفتہ

تین دن میں نکلے گا یا ایک ہی دن میں۔

(۱۴) آفتاب کی طرح سارے جہان میں پھر جائے گا۔

(۱۵) اس کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی بھی ہوگی (ظاہر ہے کہ ساٹھ گز کے جانور کے لئے حضرت موسیٰ کا عصا ایک خلال سے زیادہ حیثیت نہ رکھے گا اور حضرت سلیمان کی انگوٹھی اس کے پاس اسی صورت میں ہوگی جبکہ اس کی انگلی بہت پتلی ہو۔ تناسب جسم کے لحاظ سے تو اس کی انگوٹھی ہاتھی کے پاؤں کے برابر ہونی چاہئے۔ جس میں کوئی بڑی سے بڑی انگشتری بھی نہیں آ سکتی)۔

(۱۶) مسلمانوں کے چہروں کو وہ عصا سے ملے گا۔ وہ فوراً روشن ہو جائیں گے۔

(۱۷) کافروں کے چہروں پر اس انگوٹھی کی مہر لگائے گا۔ اس سے ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔

(۱۸) وہ کسی کو بھی نام لے کر نہیں پکارے گا (اتنا حافظہ بھی کس جانور کا ہو سکتا ہے کہ دنیا کے کئی ارب آدمیوں کے نام یاد رکھے؟)

(۱۹) روشن چہرے والوں کو بہشتی کہے گا اور سیاہ چہرے والوں کو دوزخی۔

موضح القرآن اور تفسیر احمدی کی یہ دونوں روایتیں جناب مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ نے بھی بڑی عقیدت اور وثوق کے ساتھ اپنی ''فوائد القرآن'' میں نقل فرمائی ہیں۔

غالباً ۴۵۔۴۶ء میں (جبکہ میں مشرقی پنجاب کی ایک شاہی جامع مسجد کا خطیب تھا) میں نے ایک اچھے ڈرائنگ ماسٹر سے ایک بڑے کاغذ پر انہی مذکورہ بالا تصریحات کے مطابق اس عجیب الخلق جانور (دابۃ الارض) کا نقشہ بنوایا تھا۔ اسے طبع کرا کے تقسیم کرنے کا ارادہ تھا صرف نقشہ بنوانے کا اثر یہ ہوا کہ قیامت آ گئی اور مشرقی پنجاب کے انقلاب نے مجھے پاکستان پہنچا دیا اور وہ متبرک نقشہ ضائع ہو گیا۔ اگر اب بھی کوئی آرٹسٹ صاحب اس کے مطابق ''دابۃ الارض'' کی تصویر بنا کر شائع کرا دیں۔ تو یقین ہے کہ اہل پاکستان میں اس کی ہیبت سے خوفِ خداوندی اور قربِ قیامت کا ڈر پیدا ہو جائے گا۔ لوگ اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں گے اور پاکستان کے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہندو لوگ تو اپنے گنیش جی کی تصویریں شائع کریں اور مسلمان اس کے مقابلہ میں کوئی ''اسلامی گنیش جی'' نہ پیش کر سکیں۔

ہندو لٹریچر میں گنیش جی کی ثنایوں وارد ہوئی ہے۔

جے گنیش، جے گنیش، جے گنیش دیوا
ماتا تو پاروتی پتا مہا دیوا
ناک، دنت، دیا دنت چارد بھوجا دھاری
مستک سیندور سوہے موشک سواری

یعنی گنیش جی ایسے دیوتا ہیں جن کی والدہ پاربتی جی اور والد مہادیو جی ہیں اور ان کی (ہاتھی کی طرح) سونڈ اور دانت ہیں۔ بڑے مہربان ہیں۔ ان کے چار چار ہاتھ ہیں۔ ان کے ماتھے پر سیندور بڑا زیب دیتا ہے اور ان کی سواری چوہے کی ہے۔

کتنی پاکیزہ حمد و ثنا ہے لیکن ہمارا اسلامی گنیش الملقب بہ دابتہ الارض اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس کا نقشہ یا سہ رنگی تصویر ہر مسلمان کے گھر میں۔ ہر دفتر میں۔ ہر دوکان پر آویزاں ہونا چاہئے۔ بلکہ ہر پکچر سے پہلے اسے دکھانا چاہئے تاکہ لوگ قیامت سے ڈریں۔ ورنہ کم از کم اس دابتہ الارض سے خوف کھاتے رہیں۔

حضرت مولانا تھانوی نے اس تفسیر کی رعایت کرتے ہوئے اس آیت کا جو ترجمہ فرمایا ہے۔ وہ بلفظہٖ یوں ہے:۔

اور جب وعدہ (قیامت کا) ان پر پورا ہونے کو ہوگا۔ تو ہم ان کے لئے ایک (عجیب) جانور نکالیں گے کہ وہ ان سے باتیں کرے گا کہ (کافر) لوگ ہماری (یعنی اللہ تعالیٰ کی) آیتوں پر یقین نہ لاتے تھے۔

لیجئے ''دابتہ الارض'' کی تفسیر مکمل ہوگئی یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اگر تفسیروں پر ایمان نہ لایا جائے تو مسلمان ''منکر قرآن'' ہو جاتا ہے اور اگر روایات پر ایمان نہ رکھے تو ''منکر حدیث'' بن جاتا ہے۔ لہٰذا اس اسلامی گنیش جی کی مندرجہ بالا شکل وصورت پر ایمان لانا اور اس کا انتظار کرنا ایسا ہی ضروری ٹھہرا۔ جیسا مجدد۔ مہدی اور مسیح پر ایمان لانا اور ان کا انتظار کرنا۔ گویا انسانی ہدایت وانذار (وارننگ) کے لئے دو سامان کئے گئے ہیں۔ ایک تو مسیحؑ ہیں جو آسمان سے نازل ہوں گے اور دوسرا یہ عجیب الخلقت جانور ہے جو زمین سے برآمد ہوگا۔ ایک اوپر سے دمشق کے منارے پر اترے گا اور دوسرا کوہِ صفا کے اندر سے نکل کر اوپر آئے گا۔ نبوت تو ختم ہو چکی ہے لہٰذا اب چہروں کو روشن یا سیاہ کرنے کا کام ساٹھ گز کے ''ابوالہول'' سے لیا جائے گا۔ اس جانور کے ظہور کے بعد بھی اگر قیامت نہ آئے تو پھر قیامت کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے؟ لہٰذا مفسرین نے اسے قرب قیامت کی سب سے بڑی علامت قرار دیا ہے۔ آپ خود ہی سوچئے کہ جب اس کا نقشہ بننے سے ۱۹۴۷ء کی قیامت آ گئی۔ تو اصل جانور کے ظہور کے بعد قیامت کیوں نہ آئے؟ اور ہمارے نزدیک تو فن تفسیر پر اسی وقت قیامت آ چکی جب دابتہ الارض کی اتنی ''حسین تصویر'' کھینچی گئی اور اس نے توارث اختیار کر لیا۔

دین کی صداقت یہ تھوڑی ہی ہے کہ وہ اخلاقی اقدار کو بلند کرتا ہے یا معاشی مسائل کو حل کرتا ہے۔ یا سیاسی و عمرانی گتھیوں کو سلجھاتا ہے؟ اسلام کی صداقت تو یہ ہے کہ وہ ایسے ایسے عجیب الخلقت جانوروں کی پیش گوئی کرتا ہے۔ جس کے تصور سے وہ بھی کانپ اٹھے۔ جو خدا سے بھی نہ ڈرتا ہو۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ دابہ کے معنی ''جانور'' کے بھی ہیں لیکن یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ انسان جانور نہیں بلکہ بے جان ہے؟ انسان بھی ایک جاندار مخلوق ہے۔ حیوان ناطق ہے اور متحرک بالارادہ ہے۔ قرآن میں کئی جگہ یہ لفظ صرف انسان کے لئے ہی آیا ہے۔ چند آیتیں ملاحظہ ہوں۔

ولو یواخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علی ظھرھا من دابۃ..... ۳۵:۴۵)۔

اگر اللہ انسانوں کے اعمال کی وجہ سے فوراً ہی ان کی گرفت کرلیا کرتا تو پشتِ زمین پر ایک متنفس کو بھی زندہ نہیں چھوڑتا۔

ظاہر ہے کہ بازپرس اور مواخذہ اسی دابے (متنفس) سے ہوتا ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ عام جانوروں سے مواخذہ نہیں ہوتا۔ یا مثلاً یہ آیت۔

ان شر الدواب عنداللہ الصم البکم الذین لا یعقلون۔

اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق تو بہرے گونگے ہیں۔ جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

ظاہر ہے کہ یہاں دواب سے مراد انسان ہی ہیں۔ عربی لغت میں ایک چیونٹی سے لے کر ہاتھی اور اونٹ تک ہر متحرک بالارادہ حیوان دابہ ہوتا ہے۔

زیر بحث آیت۔

(واذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دابۃ من الارض تکلمھم ان الناس کانوا بایٰتنا لا یوقنون)

میں بھی ''دابہ'' سے مراد انسان ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں ایک عام قانون قدرت بتا رہا ہے کہ جب کسی امت پر عذاب آتا ہے انہیں کرتوت کی سزا ملتی ہے اور قانون قدرت کے مطابق ان کی گرفت ہوتی ہے۔ تو ہم کوئی صاحب فکر انسان پیدا کر دیتے ہیں۔ جو چوتھے آسمان سے نہیں آتا بلکہ اسی زمین کی مخلوق ہوتا ہے (من الارض) اور وہ لوگوں کو بتاتا ہے کہ ''یہ ہلاکت و تباہی اس لئے آئی ہے کہ تم نے قانون الٰہی اور قانون فطرت اور قانون عقل پر یقین نہیں کیا اور اپنی من مانی کارروائی کرتے رہے۔ اگر آئندہ اس قسم کی بربادیوں سے محفوظ رہنا چاہتے ہو تو دوبارہ یہ غفلت اور یہ غلطی نہ کرنا۔''

ہر دور میں ایسے مفکرین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے گزشتہ امتوں کی پوری تاریخ ہی نہیں۔ بلکہ امت محمدیہؐ کی پوری تاریخ بھی اس کی گواہ ہے۔

یہ یقین فرما لیجئے کہ ہمیں اپنی اس تفسیر کی صحت پر قطعاً کوئی اصرار نہیں جو تفسیر اس سے بہتر ہو سکے۔ اسے معلوم کرنے کے لئے ہم بے چینی کے ساتھ منتظر ہیں۔ ہاں اصرار اس پر ضرور ہے کہ دابۃ الارض کی جو 'بھیانک تفسیر' کی جاتی ہے۔ وہ ہماری تفسیر سے بہت زیادہ دلچسپ ہے اگرچہ غلط ہے۔

طلوع اسلام: سورہ نمل کی مذکورہ صدر آیت (۸۲/۲۷) کی جو تفسیر ''ابن آدم'' نے بیان کی ہے ہم بھی اس سے متفق ہیں اس فرق کے ساتھ کہ ہمارے نزدیک اس میں تکلمھم کے معنی ''باتیں کرنا'' نہیں بلکہ ''زخمی کرنا'' ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی قوم قوانین خداوندی سے اعراض برت کر غلط روش اختیار کر لیتی ہے اور ان کے اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آجاتا ہے۔ تو ہم اسی زمین سے کسی ایسے صاحب اقتدار (شخص یا قوم) کو کھڑا کر دیتے ہیں جو آہنی شمشیر سے (جس کا ذکر سورۂ حدید میں آیا ہے) ان کے مزاج درست کر دیتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ

یہ (شخص یا جماعت) خدا کے نظام کی علمبردار ہو (جیسا کہ قرآن کے متعدد مقامات سے ظاہر ہے) اور یہ بھی کہ یہ خود بھی انہی سرکشوں میں سے ہو۔ جیسا کہ ارشاد ہے کہ وکذالک نولی بعض الظالمین بعضا بما کانوا یکسبون (۶/۱۳۰)۔ یا دوسری شکل وہ ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ؎

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

باقی رہی ''ابن آدم'' کی یہ تجویز کہ ''دابتہ الارض'' کا جو نقشہ ہمارے مفسرین نے کھینچا ہے۔ اس کی ایک تصویر بنوا لینی چاہئے سو عرض یہ ہے کہ ان تفاسیر کے کس کس نقشے کی تصویر بنوائی جائے؟

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغا شورش کاشمیری (مرحوم)

شاھکار رسالتؐ

(ایک معرکہ آرا تصنیف)

(عجمی تخیلات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔علامہ اقبالؒ اور غلام احمد پرویزؒ)

علامہ اقبالؒ نے تشکیل جدید الہیات کے پانچویں خطبہ میں فرمایا تھا:

''اگر قوم کے زوال و انحطاط کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم گذشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیاء خود ساختہ ذرائع سے کریں۔''

چودھری محمد احسن کے نام حضرت علامہؒ نے ایک خط میں لکھا (ملاحظہ ہو اقبال نامہ) کہ:

''میرے نزدیک مہدیت و مسیحیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی و عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ انکا عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے کوئی سروکار نہیں۔''

ایک دوسرے خط میں جو مولوی سراج دین کے نام ہے علامہؒ فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں ان کو عربی اسلام' اس کے نصب العین اور اس کی غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔''

انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار (صفحہ 193-192)۔

ڈاکٹر سید یامین ہاشمی کے نام علامہؒ کا ایک خط ہے' فرماتے ہیں:

''میری رائے میں عجمیت ایشیا کے مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ اس باطل کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ عجمیت کا اثر مذہب' لٹریچر اور عام زندگی پر غالب ہے۔''

محمد دین فوق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''عربی اسلام ہندوستان میں ایک فراموش چیز ہے۔''

(انوار اقبالؒ صفحہ 66)۔

ارمغان حجاز کا وہ مصرع۔ ع

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ

اقبالؒ کے اس شدید تاریخی احساس ہی کا نتیجہ تھا۔

☆☆☆

محولہ بالا اشارات (اقتباسات) کا اقتضاء تھا کہ دانشوران اقبال اس موضوع پر قلم اٹھاتے اور اسلامیات کی تاریخ میں عجمی اثرات کا جائزہ لیتے لیکن کسی اقبالی نے اس پر غور نہیں کیا' نہ اس طرف توجہ کی اور نہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے راستہ کی اس

سب سے بڑی روک کو دور کیا۔ اغلب خیال ہے کہ وہ اس کے اہل ہی نہ تھے اور ایک دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ ان کی رُوپہلی اور طلائی مصلحتوں میں اس کا حوصلہ ہی نہ تھا۔

☆☆☆

دو روز پہلے مولانا تاج محمود (لائل پور) کی معیت میں ایک فاضل دوست سے ملاقات ہوئی تو وہاں دوران گفتگو اسلامیات میں عجمی اثرات کا ذکر آ گیا۔ اس دوست نے جناب غلام احمد پرویز کی تازہ کتاب ''شاہکار رسالتؐ (عمر فاروقؓ) کا ذکر کیا کہ اسکا مطالعہ ہر علم دوست کا فرض ہے۔ اقبالؒ نے جس عجمی سازش کو خطوط وخطبات میں اشارۃً بیان کیا۔ شاہکار رسالتؐ اس کا تفصیلی مرقع ہے۔ بڑے سائز کے 528 صفحات کی اس کتاب میں چودھواں باب بہ عنوان (شعلہ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد) کے تقریباً سو صفحات عجمی سازش کی تفصیلات سے متعلق کئی ہزار تاریخی صفحات کا نچوڑ ہیں۔ اس جامع باب کو ایک جامع کتاب کی خصوصیت حاصل ہے۔ ہر ضمنی عنوان کے تحت اس کی تفصیل موجود ہے۔ کوئی سی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ اگر کوئی سوال ذہن میں ابھرتا ہے تو اس کا جواب انہی مباحث میں نکل آتا ہے۔ حتیٰ کہ مطالعاتی طبیعت بھی کوئی نہ کوئی نیا نکتہ حاصل کر پاتی ہے۔

☆☆☆

جہاں تک پوری کتاب کا تعلق ہے، راقم نے ابھی تک اس کا مطالعہ نہیں کیا۔ صرف چودھواں باب ہی بالاستیعاب پڑھا ہے۔ ظاہر ہے کامل مطالعہ کے بعد ہی پوری کتاب پر نقد ونظر کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ لیکن چودھویں باب کے مطالعہ سے فارغ ہو کر راقم نے محسوس کیا کہ:

(۱) پرویز نے عجم سے متعلق اقبالؒ کی ذہنی تگ و دو کو اپنے قلم کی معرفت، حقائق و معارف کے تاریخی سانچہ میں ڈھالا اور اندھیروں کو اجالوں سے متعارف کیا ہے۔

(۲) کتاب کے متعلق جیسا کہ عرض کیا قبل از مطالعہ رائے دینا مشکل ہے۔ انشاء اللہ یہ فرض بھی جلد ادا ہوگا۔ لیکن چودھواں باب تاریخ اسلام کے سیاسی وعلمی مصائب کی ایک تجزیاتی کہانی اور فی الجملہ عجم کے ہاتھوں اسلام پر کیا گزری کی، روداد ہے۔

(۳) ہو سکتا ہے کسی دائرے میں یا کسی پہلو سے بعض اکابر علماء اور محقق فضلاء کو اساسی یا جزوی اختلاف ہو لیکن راقم نے پرویز سے متعلق اپنے مستعار نظریے میں، جو علمائے کرام کے فتوے کی بدولت ذہن پر نقش تھا، ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کی۔ فی الجملہ پرویز اپنی سیاسی شدتوں اور شخصی عصبیتوں کے باوجود اسلام کے تاریخی ذہن سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر سوچتے ہیں۔ ان کے دل میں سرگزشت اسلام کی ویرانیوں پر شدید ہلچل ہے اور وہ مسلمانوں کی نئی پود کے ذہنی اضطراب کو دور کرنے کے لئے عصری افکار کے لہجہ میں اسلام کی اساس پر ان سے ہمکلام ہوتے ہیں۔

(۴) محولہ باب کے مباحث ذیل کے عنوانوں پر ہیں۔ مثلاً۔

مسلمانوں کی طاقت کا راز کیا تھا؟ مسلمانوں سے قرآن چھڑا دینے کی باطنی تحریک کا آغاز اور اسکے نتائج۔ ایران و روما کی فتوحات اور ان کا فرق۔ یزدگر کے دستہ خاص کا قبول اسلام۔ فتح قادسیہ کے بعد ایرانی ردعمل، کوفہ و بصرہ میں ایرانیوں کی آبادکاری۔ عجمی سازش کے دو نمایاں محاذ۔ روایات کا طلسم خانہ۔ مسئلہ خلافت، حق وراثت کے سیاسی مضمرات، اہل ایران کا

اپنے شہنشاہوں سے متعلق عقیدہ' عبداللہ بن سباء۔ رجعت کا عقیدہ۔امامت کا منصوص تصور۔کفر وایمان کا خط امتیاز۔مستند شیعی روایات۔ حضرت سلمان فارسیؓ۔ بنی امیہ اور بنو عباس کی رقابتیں۔ سادات و علوی۔ ابومسلم خراسانی۔ برامکہ۔ فاطمین مصر۔ دیلمی حکومت۔ بغداد کا شیعی دور۔عباسی سلطنت کا خاتمہ۔ ایرانیوں نے کتنی مدت بعد جنگ قادسیہ کا انتقام لیا۔ اسلام کی اساسات۔مختلف فرقے اور ان کے ساختہ پرداختہ نظریے۔ محرف قرآن۔ باطنی معانی۔محدث کا عقیدہ۔ کاشانۂ نبوت پر ذہنی آتشبازی۔ جامعینِ حدیث' سنیوں کے عقائد پر عجمی اثرات۔جمعِ قرآن سے متعلق شکوک وشبہات۔ ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ۔ حدیث کا مقام۔ ابن جریر طبری کون تھے؟ طبری کی تاریخ۔اسلام دین نہ رہا مذہب ہوگیا۔آیۂ استخلاف کا مفہوم بدل گیا۔ مذہب وسیاست میں ثنویت۔قانون سازی کے امکان کا خاتمہ۔نظام سرمایہ داری کا احیاء۔تقدیر کا عقیدہ۔تقدیر سے متعلق روایات۔تصوف کی حقیقت۔ ابن عربی۔ اساساتِ تصوف۔ باطنی علم کی سند۔ جہاد کے خلاف عجمی یلغار (افکار ملخص اور ان عوارض وامراض کا علاج جو مسلمانوں کے وجود کو اجتماعی طور پر لاحق ہو چکے ہیں۔

(۵) پرویز صاحب سے متعلق دینی حلقوں میں تسلسل وتواتر سے یہ فضا قائم رہی ہے کہ وہ منکر حدیث ہیں۔لیکن انہوں نے جن شگفتہ الفاظ میں اپنے عقیدہ کی صراحت کی ہے اس کے بعد معاملہ صاف ہوجاتا ہے۔

راقم استفساراً علماء سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ حضرت امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور کانٹ چھانٹ کے بعد صرف 2762 باقی رکھیں۔ امام مسلمؒ نے تین لاکھ مدون کیں اور باقی 4348 رہنے دیں۔امام ترمذیؒ نے تین لاکھ اکٹھا کیں اور 2115 کو مرتب کیا۔ امام ابوداؤدؒ نے پانچ لاکھ فراہم کیں اور 4800 کو احاطہ تحریر میں لائے۔ابن ماجہؒ نے چار لاکھ کا ذخیرہ کیا اور کتاب میں چار ہزار نقل کیں۔ امام نسائیؒ نے دو لاکھ کے خزانہ میں 4321 کو اپنے مجموعہ میں درج کیا۔ لیکن پرویز کی چتھاڑ اس الزام میں کرنا کہ وہ احادیث کو تسلیم نہیں کرتے اس کی بنیاد کیا ہے؟ پرویز ان احادیث کو واقعی تسلیم نہیں کرتے جو قرآن پاک کی تعلیمات کے خلاف ہیں اور جنہیں سرور کائناتﷺ کے ارشادات سے کوئی سی نسبت ہی نہیں۔ ایسی احادیث خلافت راشدہ کے بعد بعض ملوکانہ مصلحتوں کے تحت وضع کی گئیں یا عجمی سازش نے اپنے سانچوں میں ڈھال کے انہیں رسول اللہﷺ سے منسوب کیا۔ ایک مبحث یا مسئلے کو' جو تاریخ اسلام کا عصری مضمون ہے اور نئی پود کے دماغ اس سے دوچار ہیں' واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مقتدر علماء۔اپنی یلغار سے اس کو ٹال نہیں سکتے اور نہ یہ مسئلہ یا مبحث کفر واسلام سے متعلق ہے۔نئی پود کی سوچ کیا ہے؟ پرویز نے اسی کی نمائندگی کی اور اپنی ذہنی جدوجہد سے اسلام کے دامن سے عجمی گرد جھاڑی ہے۔بعض طبیعتوں کو شاید یہ گوارا نہیں لیکن علم کو غصہ سے روکنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔

(۶) پرویز صاحب نے اسی باب میں اپنے عقیدے کی وضاحت کی ہے۔فرماتے ہیں:

''میں نہ سنی ہوں نہ شیعہ۔ میرا تعلق کسی بھی فرقہ سے نہیں۔قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ اور میرا عقیدہ

بلکہ ایمان یہ ہے کہ خدا کی یہ کتاب عظیم دین میں سند و حجت ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا واحد معیار۔ کوئی عقیدہ، نظریہ، تصور، مسلک، مشرب، جو اس کے خلاف جاتا ہو میرے نزدیک درست نہیں، خواہ اس کی نسبت کسی طرف بھی کیوں نہ کی گئی ہو۔ اگر اس قسم کا کوئی عقیدہ بزرگان سلف میں سے کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے خواہ ان کا تعلق کسی فرقے سے ہو تو ان حضرات کے احترام کے پیش نظر میں یہی کہتا ہوں کہ ان کی طرف اس کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ انہوں نے ایسا نہیں کہا ہو گا۔'' (صفحہ 499)۔

ان الفاظ کے بعد پرویز کی شرعی چھاڑ لائق اعتنا نہیں رہتی۔ ایک مسلمان کے لئے قرآن کے مقابلہ میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا مختلف المعنی قول حجت نہیں بلکہ س سے اِباہر مسلمان کا فرض ہے۔

''شاہکار رسالت'' مضمون و موضوع کی عمدگی کے علاوہ کتابت و طباعت کے اعتبار سے بھی ایک اعلیٰ کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ نظر و فکر کی بہت سی راہیں کشادہ کرتا اور اسلام کے مثالی نظامِ ریاست کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں کہ عمر بھر وہ اس کی آرزو کرتے رہے، اس کتاب کو مسلمانوں کی ذہنی سوانح عمری کہا جائے تو صحیح ہوگا۔

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف میں

پرویز صاحب سے ہمیں خود کئی دوائر میں اختلاف ہے لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں ان کے لئے احترام کی ایک خاص فضا پیدا ہوگئی ہے۔ اقبال عجم کے متعلق جو چاہتے تھے، شاہکار رسالت ان کی اسی خواہش کا علمی مرقع اور تاریخی شہ پارہ ہے۔

پرویز کے خلاف فتوے واپس لیجئے۔

ایڈیٹر چٹان کو آج تک جناب غلام احمد پرویز سے ذاتی نیاز حاصل نہیں ہو سکا۔ کبھی ان سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی عظیم کتاب شاہکار رسالتؐ پڑھنے کے بعد ایڈیٹر چٹان کو یقین ہو چکا ہے کہ اپنی اس کتاب کی بدولت پرویز بارگاہ رسالتؐ میں سرخرو ہو کر باریاب ہوں گے اور یہ کتاب ان کے لئے توشہ آخرت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان فضلاء کے ساتھ انہیں جگہ دیں گے جن کے دل اسلام کے لئے ہر دور میں دھڑکتے رہے ہیں۔

غلطیاں ہر انسان سے ہوتی ہیں۔ ہوسکتا ہے صلحائے امت کے نزدیک کسی مقام پر ان کے قلم کو ٹھوکر لگی ہو۔ آخر وہ ایک انسان ہیں۔ لیکن ان کے سچا مسلمان ہونے میں کوئی شک نہیں۔ وہ قرآنی فکر کی ایک فاضل شخصیت ہیں۔ علماء سے دردمندانہ گزارش ہے کہ وہ محض فروعات کا شکار نہ ہوں۔ شاہکار رسالت کا مطالعہ کریں اور ضرور کریں۔

ان کی بلند فکر کے نزدیک پرویز صاحب سے کبھی تفقہ فی الدین میں کوئی چوک ہوئی ہے تو انہیں محبت سے مطلع کریں تاکہ ایک سچا دل اپنی ''کوتاہی'' کا جائزہ لے سکے۔۔ حقیقت یہ ہے کہ پرویز بھی افکار اسلام کی کربلا میں حسینی قافلہ کی ایک آواز ہیں۔ علماء کو ان سے متعلق اپنا فتویٰ واپس لینا چاہئے۔ (چٹان، مورخہ 13/5/1974)۔